حقیقتِ دعائے ربانی
جی۔ ایم۔ نعمان

حقیقتِ دُعائے ربّانی

مُصنّف

جی۔ ایم۔ نعمان

ناشرین

مسیحی اشاعت خانہ

۳۶۔ فیروز پور روڈ۔ لاہور

انتساب

بزرگ و محترم، تقدس مآب، عالی جناب بشپ چندورے ڈی۔ڈی کے بحیثیت اوّل بشپ کراچی ڈائیوسیس کی تخت نشینی کے مُبارک و مقدّس موقع سے اِس کتاب کو منسوب کرتا ہُوں۔

نعمان

تعارف

پادری غلام مسیح نعمان صاحب کی سابقہ زندگی اور ساتھ ہی ساتھ اِس امر کو سامنے رکھتے ہوئے کہ وہ پہلی مرتبہ کیسے خُداوند کے قدموں میں آئے، یہ موزوں و مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ دُعا کے عنوان پر قلم اُٹھائیں۔ اُنہوں نے دُعا کی اُس بے پناہ قوت کا تجربہ کیا ہے جس کی رسائی آسمان تک ہے۔ دنیا بیشتر برکات سے اس وجہ سے محروم رہ جاتی ہے کیونکہ مسیحی لوگ زیادہ وقت دُعا میں نہیں گزارتے۔

مجھے اُمیدِ واثق ہے کہ یہ کتاب خداوند یسُوعؔ مسیح کے وسیلے سے، جس تک ہماری دلیرانہ پہنچ ہے، خدا باپ سے پُرجوش دُعا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ آمین۔

(بشپ) چندورے۔ڈی۔ڈی۔
کراچی

ترتیب

دُعائے ربّانی

"پس تم اِس طرح دُعا کیا کرو کہ اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہی آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔

ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے، اور جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو مُعاف کیا ہے، تو بھی ہمارے قرض ہمیں مُعاف کر۔ اور ہمیں آزمائش میں نہ لا، بلکہ بُرائی سے بچا (کیونکہ بادشاہی اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرے ہی ہیں۔ آمین۔)"

حرفِ آغاز

خُداوند کی دُعا کے بارے میں کچھ تحریر کرنے کی جرأت میں نے دو باتوں کے تحت کی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ خُداوند کی دُعا جس قدر ضروری اور مفید ہے اُسی قدر ہماری کلیسیاؤں کے اکثر حلقوں میں اس دعا کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ جب خُداوند کی دُعا کو عبادتوں میں دہرایا جاتا ہے تو عوام بغیر سوچے سمجھے، طوطے کی طرح اُس کو اُگل دیتے ہیں۔ اور اُس کے مفہوم و معنی کو سوچ کر ذہن میں بٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ میری مسیحی زندگی کے آغاز سے اب تک میں نے خُداوند کی دُعا پر کوئی کتاب اُردو زبان میں نہیں دیکھی۔ اگر کچھ ہے بھی تو وُہ ناکافی بلکہ نہ ہونے کے برابر، اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ لفظ بہ لفظ انگریزی تفسیروں میں سے نقل کر کے پیش کر دیا گیا ہے۔

میں نے اِس کتاب کو لکھنے میں انگریزی اور اُردو تفسیروں کے اِستعمال سے پرہیز کیا ہے بلکہ صرف اپنے آقا و مولے سے مانگا ہے جو سب کو فیاضی سے دیتا ہے۔

قارئین اِس کتاب کو پڑھنے سے یہ بھی محسوس کریں گے کہ میں نے حوالہ جات کی بھرمار سے بھی گریز کیا ہے تاکہ آپ کا سلسلۂ مطالعہ نہ ٹوٹے۔

میں نے وہی خیالات تحریر کئے ہیں جو میری مسیحی زندگی کے مختلف تجربات
میں آئے ہیں اور جن باتوں کو مَیں نے خُداوند سے براہِ راست پایا ہے۔
یہ کتاب تصنیف و تالیف کے معیار سے بہت کم ہے۔ میں اس کو اپنی
مسیحی زندگی کی ایک ادھوری سی کوشش خیال کرتا ہوں، جس کا صرف یہ
مقصد ہے کہ خُداوند و مُنجّی مسیح کی تعلیم کو سادگی کے ساتھ پیش کیا جائے۔

اس کتاب کی تمام غلطیوں کو میری کم علمی اور نااہلیت پر محمول کر کے
معاف فرما دیجئے گا اور جو کچھ خداوند آپ کو اس کتاب کے وسیلہ سکھائے
اُس پر عمل کرنے کی خداوند سے مدد مانگیں۔ شکریہ۔

آپکی دُعاؤں کا محتاج
نعمان

دُعائے رَبّانی کا موقع

اِنجیلِ مُقدّس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دس احکام کی طرح دُعائے
ربّانی بھی دو دفعہ شاگردوں کو سکھائی گئی۔ پہلی دفعہ پہاڑی وعظ کے موقع
پر (متی ۶: ۹-۱۳)۔
پھر خُداوند یِسُوعؔ نے اپنے مصلوب ہونے سے چھ ماہ پہلے اپنے شاگردوں
کی درخواست پر یہ دعا دوبارہ اپنے شاگردوں کو سکھائی (دیکھیئے لوقا ۱۱: ۱-۴)۔
اِس دعا کا دو دفعہ سکھانا اِس کی اہمیّت کو اور بھی زیادہ واضح کر دیتا ہے۔
اِس صورت میں ہمارے لئے اِس دُعا کی حقیقت کو جاننا اور بھی زیادہ ضروری
ہو جاتا ہے۔

دُعائے رَبّانی کا مقصد

خُداوند کی دُعا گو متی کی انجیل کے چھٹے باب کی نویں آیت سے شروع
ہوتی ہے، تو بھی اس کا سلسلہ پانچویں باب کی پہلی آیت سے شروع ہوتا ہے۔
جو بات مصنّف اِس ضمن میں ثابت کرنے کا خواہشمند ہے وہ یہ ہے کہ پہاڑی
وعظ اور خصوصاً دُعائے رَبّانی کی تعلیم خُداوند نے صرف اپنے شاگردوں کو

دی تھی۔

پہاڑی وعظ کے شروع میں یہ لکھا ہے کہ "وہ اپنی زبان کھول کر اُن کو (شاگردوں کو) یوں تعلیم دینے لگا" (متی ۵: ۲)۔ اور جب خُداوند نے دُعائے ربّانی یعنی اپنی دُعا سکھائی تو یہاں پر بھی وہ اپنے شاگردوں ہی سے مخاطب ہے یعنی اُس جماعت سے جس کو خداوند یسُوعؔ نے اپنی بہت بڑی خدمت کے لئے چن لیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو بقول پطرسؔ رسول سب کچھ چھوڑ کر اُس کے پیچھے ہو لئے تھے۔ وہ خداوند کے خاص لوگ تھے، اور اُن کی زندگی میں خداوند سے سیکھنے کا شوق موجود تھا۔

جب خداوند نے اپنی یہ دُعا سکھائی تو اُس کا منشا یہ نہیں تھا کہ اِس دُعا کا وظیفہ کیا جائے یا روزانہ دہرایا جائے یا صرف یہ دُعا بچوں کو حفظ کرانے کے لئے ہے، بلکہ خداوند کے سامنے پہلا مقصد یہ تھا کہ یہ دعا اور اُس کی تعلیم خداوند کے اپنے مخصوص لوگوں اور شاگردوں کے لئے وقف ہے، یعنی اُن لوگوں کے لئے جو خداوند کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے تیار ہیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ یہ دُعا خداوند کی طرف سے اس کے ایماندار لوگوں کے لئے ایک جامع اور مکمل قسم کا ضابطۂ حیات ہے۔

اِس دُعا میں خداوند نے اپنے کام، اختیار، اور مسیحی زندگی کے زرّیں اُصولوں کا مکاشفہ اپنے لوگوں کو عطا کیا ہے۔

حصُولِ فرزندیّت

"اَے ہمارے باپ"۔ خداوند کی دُعا کے ابتدائی الفاظ یعنی "اَے ہمارے باپ" ہمارے لئے ایک بہت بڑی دعوتِ عمل کا حکم رکھتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر کسی کام اور بات کی تکرار اور اِعادہ اُس کے معنی اور مطلب کو دفن کر دیتا ہے یہی سلوک خُداوند کی دُعا سے کیا جاتا ہے۔ جب ہم "اے ہمارے باپ" کے الفاظ کو دہراتے ہیں تو ہم ذرّہ بھر بھی خیال نہیں کرتے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ جب میں نے یا آپ نے خدا کو "باپ" کہا ہے تو اس سے ایک تعلق اور رشتہ کا اظہار ہوا ہے، اور یہ رشتہ خداوند باپ اور میرے مابین ہے۔ خدا میرا "باپ" ہے، میں اور آپ اس کے بچے (بیٹے) ہیں۔ یہ کس قدر بڑا اعزاز ہے! خدا کا فرزند ہونے کا اعزاز!۔

سب سے پہلی غور طلب بات یہ ہے کہ میں اپنے آپ سے سوال کروں کہ کیا میں نے اس فرزند کے حق کو حاصل کر لیا ہے؟ بقول یوحنّا رسول (یوحنّا ۱: ۱۲، ۱۳) "لیکن جتنوں نے اُسے قبول کیا، اُس نے انہیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا، یعنی اُنہیں جو اُس کے نام پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ نہ خون سے، نہ جسم کی خواہش سے نہ انسان کے ارادہ سے، بلکہ خدا سے پیدا ہوئے"۔ مذکورہ بالا آیات ہمارے سامنے دو عملی باتیں پیش کرتی ہیں۔ **اوّل** یہ کہ مجھے خُدا کو اپنا "باپ" کہنے سے پہلے اُس کے بیٹے یسُوعؔ کو قبول کرنا چاہئے، جس طرح

شاگردوں نے کیا۔ شاگردوں کی یہ قبولیت بڑی سادہ اور بلند تھی۔ انہوں نے ناصرت کے ایک بڑھئی، یوسف کے بیٹے (یسوع) کو جس کے پاس مادی دنیا میں کچھ بھی نہیں تھا، اپنا سب کچھ قبول کر لیا۔

بعض اوقات ہم خداوند کو قبول کرنا تو چاہتے ہیں، لیکن صرف ایسے خداوند کو جو ہمارا کفیل، محافظ و مددگار ہو۔ اور جو ہماری تمام ضروریات کو پورا کر سکے۔ لیکن یہ خود غرضی ہے۔ اس رویہ کے پس منظر میں اور اسکی تہہ میں میرا ذاتی مفاد اور لالچ موجود ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ جب مسیح کو قبول کرنے کے لئے آئیں تو بڑی سادگی کے ساتھ شاگردوں کی طرح قبول کریں، اور جو ذاتی خواہشات اور جذبات اس قبولیت میں پوشیدہ ہوں اُن کو دور کر دیں، جس طرح شاگردوں میں سے بعض نے اپنے ماہی گیری کے جال، اور کسی نے اپنی محصول کی چوکی کو خیر باد کہہ دیا اور کامل اطاعت و پیروی کے لئے تیار ہو گئے۔

اکثر حالتوں میں ہم خداوند سے فرزندیت کا حق حاصل کرنے کے آرزومند ہوتے ہیں، لیکن کچھ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ حوارینِ مسیح نے محسوس کیا تھا کہ انہیں اس مادی زندگی کے سب مشاغل مسیح کی پیروی سے روک رہے ہیں۔

ممکن ہے کہ ہماری مشکلات مختلف اور شاید شاگردوں کی مشکلات سے بھی سنگین قسم کی ہوں۔ بعض اوقات ہم ظاہری اور نمایاں رکاوٹوں کو دور بھی کر دیتے ہیں۔ خداوند کے لئے راہ ہموار بھی کر دیتے ہیں کہ وہ ہمارے قریب اور اندر آئے اور ہم اس کو قبول کر کے اس کے وسیلہ سے خدا باپ سے فرزندیت کا حق حاصل کر سکیں۔ لیکن بات نہیں بنتی۔ خداوند کو ہماری

زندگی میں پوری آزادی اور ہم کو اس میں پوری خوشی اور دلیری حاصل نہیں ہوتی۔

اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم سب کچھ خداوند کے قدموں پر ڈال دینے کے بعد بھی خود کو خداوند سے دور رکھتے ہیں۔

مصنف کی اپنی زندگی میں ایسا دور آیا جب ایسا محسوس ہوا کہ خداوند کو اس کی زندگی کی فلاں بات سے نفرت ہے۔ ترک کر ڈالی! فلاں عادت کو ترک کر دینا چاہیئے، ترک کر دیا۔ لیکن زندگی پوری خوشی اور روح کی آزادی سے خالی رہی۔ کچھ مدت گذر جانے کے بعد ابلیس کے فریب اور دھوکہ کا بھرم کھلا کہ اُس نے یہ اجازت نہ دی کہ مصنف اپنی زندگی کو خداوند کے قدموں پر ڈال دے، یا خداوند کو اپنی زندگی کا پورا اختیار دیدے۔

وہ باتیں، عادتیں اور لذتیں جو ایک وقت پر زندگی میں داخل ہو کر ایک خاص وقت پر زندگی میں سے خود بخود نکل جاتی ہیں، ان کی قربانی سے خداوند کو اس وقت تک خوشی نہیں ہوتی، جب تک میں خود اُس کو ذاتی طور پر اپنی زندگی میں قبول نہیں کرتا۔

خداوند مسیح کو جو بات شاگردوں کی زندگی میں پسند آئی، وہ شاگردوں کی قربانیاں اور ایثار نہیں تھا بلکہ ان کا سادہ ایمان اور پوری فرمانبرداری تھی۔

کبھی کبھی ہم صرف یہودہ اسکریوتی کے غیر مخلصانہ رویّہ کے تحت سب شاگردوں کے لئے رائے قائم کر لیتے ہیں کہ وہ سب ہی دُنیا دار تھے۔ اُن کی مسیح سے اُمیدیں غلط تھیں۔ انہوں نے دنیوی مرتبہ حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ پطرس خداوند مسیح کو اس کی خدمت سے باز رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

جہاں تک یہوداہ اسکریوتی کا سوال ہے، تو اُس کی یہ حالت مجھے خبردار کرتی ہے کہ میں مسیح کے سامنے نالائق نہ ٹھہروں۔ علاوہ اِس کے یہوداہ اسکریوتی کی کہانی میں مسیح کی برداشت کی انتہا، اور انسانی زندگی میں گناہ کی بگاڑ کے سبب اِنسان کی مسلسل سرکشی کا سبق ہے۔ مُصنّف اِس سے یہی سبق حاصل کرتا ہے کہ جب خداوند نے یہوداہ اسکریوتی جیسے غیر مخلص، لالچی اور دودِلے شخص کی پورے تین برس تک برداشت کی، مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ میں دوسروں کی زندگی کے لئے فتوے صادر کرتا پھروں کہ فلاں کا یہ رویّہ خداوند کو پسند نہیں۔ ہمارے مسیحی اداروں اور کلیسیاؤں میں اکثر الزام تراشیاں، شکایات اور غیبت ہوتی ہے۔ اور ہم دوسروں کے بارے میں فیصلہ کرنے میں بہت جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ ادھر کسی نے دوسرے کی شکایت کی، اُسی وقت عدالت کا سماں پیدا ہو گیا، اور محض ایک شخص کی شکایت پر دوسرے کا نقصان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن خداوند نے اسوقت تک یہوداہ اسکریوتی کی برداشت کی جب تک اُس نے اپنے لئے ہلاکت کا راستہ تلاش نہ کر لیا۔

شاگردوں نے مسیح سے جو غلط توقعات کیں، اُنکا یہ رویّہ ہماری جسمانی زندگی میں بشری کمزوری ظاہر کرتا ہے۔ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان تجربات میں سے گزرتے رہتے ہیں اور شاگرد بھی باوجود ان تمام کمزوریوں اور نالائقیوں کے دل سے خداوند کی عزّت کرتے تھے۔ وہ خداوند کو قبول کر چکے تھے جس کا اظہار پطرس جیسے کمزور انسان نے بھی کیا کہ "تُو زندہ خدا کا بیٹا مسیح ہے" اور یہی وجہ تھی کہ ان کے پاس خدا کے فرزند ہونے کا حق موجود تھا۔

دوم۔ جو مجھے، آپ کو، اور ہر ایماندار کو خداوند کی فرزندیّت کا مرتبہ عطا کرتا ہے، وہ "خداوند سے پیدا ہونا" ہے۔ خداوند کا فرزند ہونے کے بارے میں جو غلط خیالات کسی کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں انکی صفائی یوحنا ۱: ۱۳ میں کر دی گئی ہے۔

"نہ خون سے" یعنی بدنی پیدائش کے طریقہ سے نہیں۔ میں ایک مسیحی خاندان میں پیدا ہو کر خداوند کی فرزندیت کا حق وارثت کے طور پر حاصل نہیں کر لیتا۔ میرا خاندان یا میرے والد اور والدہ کی روحانی زندگی میرے لئے اس حق کو حاصل نہیں کر سکتی۔ وہ وسائل جن کا خونی رشتہ سے تعلق ہے خداوند سے فرزندیّت کے حق کو دلانے کے لئے ناکافی ہیں۔

"نہ جسم کی خواہش سے"۔ حقِ فرزندیّت کو حاصل کرنے کے لئے جسمانی کوشش اور تردّد کو دخل نہیں۔ میری اپنی تدابیر لاحاصل ہیں۔ اکثر اوقات ہم اپنی غیر تبدیل شدہ زندگی پر روحانی لباس اوڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، بالکل اُس شخص کی طرح جو اپنے پرانے اور زنگ آلودہ صندوق پر خوبصورت سا رنگ کر کے اُسے چمکا لیتا ہے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد ذرا سی ٹھوکر سے وہ رنگ اتر جاتا ہے اور زنگ آلودہ صندوق کی اصل صورت نظر آتی ہے۔

"نہ انسان کے ارادہ سے"۔ مسیحی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے ہماری جدوجہد، مسیحانہ قسم کی اداکاری اور بہروپ کو بھی اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ مُصنّف نے مسیحی زندگی کے مختصر سے تجربہ اور پاسبانی خدمت کے دوران ایک بات کو بغور دیکھا کہ ہماری کلیسیاؤں کے بیشتر لوگ اِس کوشش میں رہتے ہیں کہ اپنی ظاہری راستبازی یعنی اپنی عبادت، ریاضت اور خیرات

سے خُداوند سے اس فرزندیّت کے حق کو حاصِل کرلیں۔

یہ ابلیس کا خوبصورت فریب جس سے مغلوب ہو کر ہم دوسرے سب اقدام کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں لیکن وہ خاص کام جس کو "قبولیت" کہتے ہیں، جس سے ہم خدا کے خاندان کے فرد بن جاتے ہیں، اس طرف قدم اٹھانے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

بعض غلط فہمیوں کے دور ہو جانے کے بعد یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسیحی خاندان میں پیدا ہونا ہماری کوشش اور جدوجہد، مسیحی اداکاری اور بہروپ مجھے خداوند کا فرزند ہونے کا حق نہیں دلوا سکتے تو پھر کیا اُمید اور کیا طریقہ ہے؟

مسیحی علمِ الٰہی میں نوزادگی یا نئے سرے سے پیدا ہونے کی تعریف اِس طرح سے کی گئی ہے "نئے سرے سے پیدا کرنا، خدا کے مُفت فضل کا وہ فعل ہے جس کے ذریعہ سے وہ انسان کی گناہ آلودہ فطرت کو نکال دیتا ہے اور پاک روح کے ذریعہ سے اُسے نئی سرشت یا طبیعت عطا کرتا ہے، جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان گناہ کی بجائے نیکی اور پاکیزگی کی طرف رجوع کرتا ہے اور نافرمانی کی بجائے خداوند کی فرمانبرداری اور پیروی میں خوشی محسوس کرتا ہے۔"

خداوند یسُوعؔ مسیح نے خود فرمایا ہے، جو نئے سرے سے پیدا نہیں ہوتا، وہ خدا کی بادشاہی کو دیکھ نہیں سکتا۔ اگر وہ خدا کی بادشاہی یا اس کی حضوری کو دیکھ نہیں سکتا تو اُس میں داخل ہونا بہت دور ہے۔ اِس صورت میں جو شخص خدا کا فرزند نہ ہونے کی صورت میں یعنی نیا جنم پائے بغیر خدا کی بادشاہی سے محروم ہے، اس کو یہ حق کس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ

وہ یہ کہے "تیری بادشاہی آئے"؟ ایسے شخص کو سب سے پہلے خُداوند کو قبول کرکے اُس سے خدا کا فرزند ہونے کا حق حاصِل کرنے کی ضرورت ہے۔

خداوند مسیح نے جب اپنے شاگردوں سے کہا کہ تم اِس طرح دُعا کیا کرو تو وہ شاگرد اِس حق کو پا چکے تھے۔ ان کی عملی زندگی اِس بات کو ظاہر کرتی تھی، اور خداوند نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ اس دُنیا کے نہیں۔ "خدا سے پیدا ہونا" تبدیلیِ حیات، تبدیلیِ افکار و رجحانات کا نام ہے۔

مسیحی کلیسیا کی تاریخ کے ابتدائی دَور کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو جو مسیحی کلیسیا میں داخل ہوتے تھے، ایک عرصہ گذر جانے، بپتسمہ پا لینے، اور کلیسیا کے باقاعدہ، مضبوط رکن بن جانے کے بعد خداوند کی دعا میں شریک ہونے کی اجازت ملی تھی، کیونکہ یہ خدا کے حقیقی فرزندوں کی دُعا ہے۔

میں کلیسیا میں بچوں کو خداوند کی دعا سکھانے کا مخالف نہیں ہوں لیکن میں اِس بات کو بھی بڑی شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ خداوند کی دعا کا استعمال اِس قدر رسمی اور سطحی نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے ہمیں اسقدر بے پروائی نہ برتنا چاہیئے۔ اور خصوصاً ان لوگوں کو جو بقول پُولس رسول "خدا کے بھیدوں کے مختار" ہیں سوچ سمجھ کے ساتھ تعلیم دینا چاہیئے۔ جب وہ لوگ جو بچپن سے خداوند کی دعا کو دہراتے آئے ہیں اپنے شعور میں پختہ اور نیکی اور بدی کو پہچاننے کے قابل ہو جائیں تو ان سے سوال کرنا چاہیئے کہ جب وہ "اے باپ" کہتے ہیں تو اُس سے کیا مراد ہے؟ کیا خدا ان کا باپ ہے؟ کیا وہ بھی خدا کے خاندان میں پیدا ہوئے ہیں؟ جب خداوند نے مجھ پر اِس دُعا کے بارے میں اپنا بھید کھولا تو میں

نے کلیسیا میں خداوند کی دعا کی تعلیم دینے کی اپنے اندر ایک زبردست تحریک
محسوس کی، اور جب لوگوں سے سوال کئے گئے تو لوگوں کے لئے یہ ایک
انوکھی تعلیم تھی اور خداوند نے میری اس صاف گوئی کو بہت سے لوگوں
کے لئے باعث برکت بھی ثابت کیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے رسمی قسم
کی مسیحیت کو ترک کرکے خداوند کی فرزندی کو حاصل کیا۔

ا۔ خدا کے فرزندوں کا درجہ

کائنات کا سارا نظام ایک اصول کے تحت چل رہا ہے۔ جس قدر کسی
شے یا انسان کا درجہ بلند ہوتا ہے اُسی قدر اس سے توقعات بھی بڑھ جاتی
ہیں اور اُس کے فرائض زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ جب خداوند ہم فانیوں
کو جلال دیتا ہے، جو اپنی ذات اور اعمال میں نہایت گھنونے، آوارہ اور
برگشتہ ہوتے ہیں، انہیں اپنی فرزندیت میں قبول کرتا ہے، تو اس بلند درجہ
کے باعث ہمارے فرائض بھی زیادہ اہم ہو جاتے ہیں، اور یہ توقع کی جاتی ہے
کہ میں خداوند کا فرزند ہونے کی حیثیت سے اپنی زندگی کی اصلاح کروں۔
خدا کے فرزند کی زندگی میں اس بات کا شدید احساس ہونا چاہیئے کہ اُس
کی زندگی کی کوئی حرکت یا فعل اس "باپ" کے نام و ناموس کے لئے بے عزّتی کا
باعث نہ ہو، کیونکہ اس دنیا میں انسان کی بلندی یا پستی اُس کے اخلاق و چلن
سے ظاہر ہوتی ہے۔ جب ہماری زندگی کے باغی عناصر اور خواہشات ہمارے
درجہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوں تو ہمیں خدا باپ سے دعا کرنے کی ضرورت
ہے۔ خداوند جو میرا بنانے والا ہے، جس نے مجھ کمزور کو شرف فرزندیت بخشا
ہے وہ خود میری مدد کے لئے تیار رہتا ہے۔ جب اُس نے مجھے جو گناہ کے

ہاتھ بکا ہوا تھا اپنی فرزندیت میں قبول کیا ہے تو اس سے اُس کی ذمہ داری
بڑھ جاتی ہے اور وہ اپنی اس ذمہ داری کو بخوبی نبھانے پر قادر ہے بشرطیکہ
میں بھی وفاداری سے اس کے ساتھ لپٹا رہوں۔

ب۔ خدا کے فرزندوں کی برادرانہ محبّت

ایک اور چیز جو خداوند اپنے فرزندوں میں دیکھنے کا خواہش مند ہے
وہ "برادرانہ محبّت" ہے۔ ویسے تو ساری کی ساری دنیا ایک ہی خاندان ہے۔
ایک ہی خاندان نے بڑھ کر وسیع صورت اختیار کر لی ہے، اور یوں ایک
خاندان سے بہت سے خاندان، خاندانوں کو ملا کر ایک قوم، ایک قوم
سے بہت سی اقوام، اور بہت سی اقوام کو ملا کر ایک دنیا ہے۔ یہ پرانا
تاریخی رشتہ ہمیں دنیا کے تمام انسانوں سے محبّت کرنے کی دعوت دیتا
ہے، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں جنگ کی آگ
سلگ رہی ہے جو کسی بھی وقت ایک بہت بڑے شعلہ کی صورت اختیار
کر کے بنی نوع انسان کے پورے کے پورے خاندان کو تباہی کے گڑھوں
میں دھکیل سکتی ہے۔ انسان اپنے خاندان کے دوسرے افراد کیلئے تباہی
اور بربادی کے منصوبے تیار کر رہا ہے "آج پھر انسان ہے مائل غارتگری"۔
اوّل تو شاعر مشرق کا قول ہے "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"
لیکن اگر مذہب اور عقائد کو ایک طرف کرکے انسان اپنے ماضی اور تاریخی
پس منظر کو ایک سرسری نظر سے دیکھے تو اُس کو معلوم ہو جائیگا کہ اُس کی
منافرت، تعصب اور ہوس ملک گیری خاندانی رشتوں کے منافی ہے، وہ
رشتے نہایت گہرے اور لا تبدیل ہیں۔

خدا کے مقدس کلام میں خدا کی عطا کردہ الہامی تاریخ سے ہم سیکھتے ہیں
کہ دنیا میں تمام قسم کی بدامنی، دشمنی اور حرصِ ملک گیری شیطانی بگاڑ کے سبب
سے ہے۔ یہ دنیا کے سردار کا کام ہے جس نے تمام دنیا کو گمراہ کر رکھا
ہے تاکہ اس کا تسلّط قائم رہے۔

لیکن ہم یہاں پر خدا کے فرزندوں کا ذکر کر رہے ہیں جنہوں نے
اپنے رشتہ کو خدا کے ساتھ استوار کر لیا ہے اور خدا کے بیٹے مسیح کے
طفیل حقِ فرزندیت کو حاصل کر لیا ہے۔ جو ابلیس کی گمراہی سے چھوٹ
گئے ہیں اُن سے خداوند برادرانہ محبّت اور مساوات کی توقع کرتا ہے۔

کس قدر اذیت دہ اور شرم کا مقام ہوتا ہے جب ہم اپنی کلیسیا اور
خاص طور سے ان لوگوں میں برادرانہ محبت کی کمی پاتے ہیں جو اپنے آپ کو
خدا کا فرزند کہتے ہیں!

باہمی اختلافات ایک فطری بات ہیں۔ اختلافات کا نہ ہونا یہ ظاہر کرتا
ہے کہ لوگوں کی عقل بیدار نہیں ہے، اور اختلافات کا موجود ہونا یہ ظاہر
کرتا ہے کہ لوگ اپنی انفرادیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ لیکن اختلافات
کا اسقدر سنگین صورت اختیار کر جانا کہ رشتۂ محبت ہی ٹوٹ جائے،
فرزندیت کی توہین ہے۔

خداوند مسیح کے رسولوں اور ابتدائی کلیسیا کے بزرگوں میں بھی اختلافات
پائے جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے بعض باتوں میں اختلاف رکھتے
تھے، ایک دوسرے کو ملامت و نصیحت کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود
ان کلیسیاؤں کی کامیابی و کامرانی کا سبب یہ تھا کہ وہ برادرانہ محبت کو کسی بھی
ذاتی فائدہ پر قربان کرنے کو تیار نہ تھے۔

اسی لئے جب میں یا آپ اس دُعا کے یہ ابتدائی الفاظ کو دُہراتے ہیں
کہ "اے ہمارے باپ" تو ہمیں اپنے آپ کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ اگر
خدا میرا باپ ہے تو کیا اُن سب کے لئے میرے دل میں محبت ہے جو اُس
کو میری طرح "باپ" کہتے ہیں؟

ج۔ خُدا کے فرزندوں کے حُقوق

جب مجھے اور آپ کو خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا گیا تو بقول مقدس
پولس رسول "اگر فرزند ہیں تو وارث بھی ہیں یعنی خدا کے وارث اور مسیح
کے ہم میراث" (رومیوں ۸: ۱۷)۔ ہماری پاکیزہ زندگی، برادرانہ محبت کا اظہار،
بنی نوعِ انسان کے لئے فکر مندی و ہمدردی، یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں
کہ ہم خدا کے فرزند ہیں (۱۔ یوحنا ۴: ۷)۔ اگر فرزند ہیں تو "وارث" یعنی خدا کے
وارث اور مسیح کے ہم میراث۔ خداوند ہمیں فانی اور مادی چیزیں میراث میں
نہیں دیتا، بلکہ خود ہماری میراث بن جاتا ہے۔

لیکن اکثر ہم مادی، فانی اور فضول چیزوں کے حصول کے لئے ضد کرتے
رہتے ہیں، اور خدا کو اپنی میراث ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ خدا
جس نے کائنات اور اس کی تمام چیزوں کو وجود بخشا، جس کی مرضی اور حکم
کے بغیر اس دنیا میں کچھ بھی عمل میں نہیں آ سکتا، جو تمام انسانوں کی تمام تر
ضروریات سے واقف ہے، اُسکو قبول نہیں کرتے۔

حضرت داؤد کو اس بات سے انتہائی خوشی ہوتی تھی کہ خداوند اُس کی
میراث ہے (زبور ۱۶: ۵)۔ جب خداوند خود ہماری میراث ہو جاتا ہے تو اُس
کی وہ سب برکات جو ہماری روحانی اور بدنی زندگی کی نشوونما اور ترقی کے لئے

ضروری ہیں ہماری ہو جاتی ہیں۔

موجودہ دَور میں کلیسیا کے بعض یا اکثر لوگوں کی ناکامی اور ہماری زندگی میں خدا کی برکات کے فقدان کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ "خداوند ہماری میراث" نہیں ہوتا۔

مصنّف کی اپنی زندگی میں ایک وقت آیا تھا، جب اُس نے اِس مادی دنیا اور انسان کی عطا کردہ تمام مراعات اور آسائشوں کو ٹھکرا کر خداوند کو اپنی میراث مان کر اس کا یقین کر لیا۔ ان الفاظ کو لکھتے وقت میرا دِل خداوند کے لئے شکر گذاری کے جذبات سے بھرپور ہے کہ مجھے میری اس غیر فانی میراث سے کبھی بھی مایوسی نہیں ہوتی۔ خداوند جو میری وفادار میراث ہے، اُس نے ہر وہ نعمت، جس کی وہ میری زندگی میں ضرورت محسوس کرتا تھا، بر وقت، با افراط اور بغیر مانگے دی۔ اس ضمن میں مجھے آدمِ اول کی زندگی کی ایک بات یاد آتی ہے کہ جب تک خدا آدم کی میراث تھا، تو زندگی کی ہر چیز بلکہ تمام موجودات آدم کی تھیں۔ لیکن جب آدم نے اپنی میراث "خدا" سے مُنہ پھیر لیا، جب اُس نے خیال کیا کہ حوّا مجھے خدا سے بہتر مشورہ دے سکتی ہے تو اُس سے سب کچھ چھن گیا۔

اور اب انسان کی زندگی کا یہ عالم ہے کہ وہ اُس میراث کو تو پھر سے پانے کی کوشش نہیں کرتا، لیکن جو چیزیں اُس میراث میں شامل ہیں اور جن کی انسان کو ضرورت ہے ان کے حصول کے لئے سرگرداں ہے، جو اس انسان کو نہیں مل سکتیں۔ انسان کی اِس بے بسی اور زبوں حالی کا صرف یہی علاج ہے کہ وہ خدا کا ہو جائے، اُس کا فرزند بن جائے۔ مسیح کو قبول کرے تو خداوند اس کی میراث بن جائے گا اور زندگی کی ہر نعمت اُس کو مل جائے گی،

کیونکہ یہ خداوند کا اپنا وعدہ ہے، اور وہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے۔ لیکن اِس میراث کو حاصل کرنے کی جو شرائط ہیں ان کو پورا کرنا ہمارا کام ہے، یعنی یہ کہ خدا کے مسیح کو اپنا شخصی نجات دہندہ قبول کر کے خدا کو اپنی میراث میں لے لیں۔

مقدس پولس رسول فرماتا ہے کہ "سب چیزیں تمہاری ہیں، خواہ پولس ہو، خواہ اپلوس، خواہ کیفا، خواہ دنیا، خواہ زندگی، خواہ موت، خواہ حال کی چیزیں، خواہ استقبال کی سب تمہاری ہیں اور تم مسیح کے ہو اور مسیح خدا کا ہے" (۱-کرنتھی ۳: ۲۱-۲۳)۔ کس قدر خوبصورت ترتیب ہے، یعنی سب چیزیں تمہاری ہیں اگر تم خدا کے مسیح کو اپنا مالک و منجی مان لو۔ اگر اُس کو اپنی زندگی کا مالک ماننا نہیں چاہتے تو اس دنیا اور اُس کی چیزوں کی تلاش میں دنیا میں دھکّے کھاتے پھرو یہ تم کو نہیں مل سکیں گی کیونکہ تم اُس کے نہیں ہو جس کی یہ ساری کائنات ہے۔

مصنّف ان لوگوں سے اتفاق نہیں کرتا جو غربت و افلاس، جہالت و ناداری کو مسیحی زندگی کا زیور خیال کرتے ہیں، اور نہ ہی مجھے ان لوگوں سے اتفاق ہے جو مسیحی زندگی کو عیش و عشرت خیال کرتے ہیں بلکہ میرا یہ ایمان ہے کہ خداوند کے فرزند زندگی میں کسی نعمت کے محتاج نہیں ہو سکتے۔ داؤد کا یہ تجربہ تھا کہ شیر کے بچے جنہیں اپنی قوت پر فخر ہے بھوکے ہو سکتے ہیں لیکن خدا کے طالبوں کو کسی نعمت کی کمی نہیں ہو سکتی۔

د۔ خُدا کے فرزندوں کا ایمان

عبرانیوں کے خط کے مطابق "ایمان اُمید کی ہوئی چیزوں کا اعتماد، اور

اندیکھی چیزوں کا ثبوت ہے" (عبرانیوں ۱۱: ۱)۔ مسئلۂ ایمان نہایت نازک اور غور طلب بات ہے کیونکہ ہمارے معاشرہ میں اگر کسی کو بے ایمان کہہ دیا جائے تو بہت سے جھگڑے جنم لے لیتے ہیں اور اس قسم کے الفاظ کو لوگ اپنے لئے گالی تصور کر لیتے ہیں۔

لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن باتوں کے بارے میں ہم بڑے سرگرم پائے جاتے ہیں ان کا ہماری سمجھ اور شعور سے کوئی بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ہم ایماندار ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن خدا پر اعتماد کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ سب چیزیں جو خداوند نے ہمارے لئے اپنے ارادہ میں رکھی ہوئی ہیں اُنکو ماننے کے لئے تیار نہیں اور یہ رویہ خدا کے بیٹوں کے ایمان کے خلاف ہے۔

ایک دفعہ مجھے ایک مسیحی خاندان سے ملاقات کا موقع ملا، جس میں ایک پانچ سالہ بچہ تھا۔ یہ بچہ شام کے وقت باہر جا کر دوسرے بچوں سے کھیلنا چاہتا تھا۔ شام کا وقت تھا اور باہر کچھ سردی بھی تھی۔ اُس کی ماں اِس بچّے کو اندھیرے سے خوفزدہ کرنے کی غرض سے کہہ رہی تھی "باہر اندھیرے میں بلّی ہے"۔ بچہ نے نہایت سادگی اور پُریقین انداز میں اپنی ماں سے کہا "کوئی بات نہیں وہ بلّی مسیح خداوند کو بھی تو کھائیگی، وہ میرے ساتھ جو رہتا ہے"۔ یہ بچّہ اندھیرے سے خوفزدہ اِس لئے نہیں ہُوا کیونکہ اس کو تسلی تھی کہ مسیح خداوند اُس کیساتھ رہتا ہے اور اگر اندھیرے میں کوئی خطرہ پیش آیا تو مسیح خداوند بھی اُس کیساتھ خطرہ میں پڑیگا۔ اس بچہ کو یہ بھی یقین تھا کہ مسیح خداوند کے پاس طاقت ہے یا کم از کم اُس سے تو زیادہ قوی ہے اور اسکی مدد کر سکتا ہے۔

خداوند اپنے بچوں سے اِس قسم کے ایمان کی توقع کرتا ہے۔ لیکن ہم اکثر یہ خیال کرتے ہیں کہ جن حالات سے ہم دوچار ہیں، ان حالات میں ہم اکیلے اور

تنہا ہیں اور شائد خداوند کو اِس سے کوئی سروکار نہیں، میری سب مشکلات فقط میری ہیں اور خداوند اس مشکل زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے خیالات یہ ثابت کرتے ہیں کہ خداوند غافل ہے اور اُسے ہماری فکر نہیں۔

اگر آپکو اس بات کا قوی یقین ہے کہ ہم اُسکے فرزند ہیں تو آپ ایمان رکھیں کہ وہ آپ کو کبھی بھی اکیلا چھوڑنے کو تیار نہیں۔ جب ہماری زندگیاں پیاسی اور ادھوری ہوتی ہیں، اور اِس دنیا کے طوفانی سمندر کی لہریں ہمیں ڈبونا چاہتی ہوں تو ہمیں خداوند کو پکار کر کہنا چاہیئے، اے خداوند مجھے بچا! اے خداوند میری کم اعتقادی کا علاج کر! وہ ضرور آپ کی مدد کرے گا کیونکہ وہ خود ہمارے ساتھ ہے۔ جب ہم نے اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا تو یہ ہماری کوتاہ نظری اور کم اعتقادی کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

آسمانی باپ

خدا کی ابوّیت اور ہماری فرزندیت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اِس لئے ہم اس حصّہ میں بجائے خدا کی ابوّیت کے مفہوم پر غور کرنے کے، اِن باتوں پر غور کریں گے جو اس رشتہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

ا۔ پاکیزگی

جب خدا ہمارا باپ ہے تو اس سے دو باتیں قدرتی طور پر پیدا ہو جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ رشتہ وہ ہے جو باپ اور بیٹوں کے مابین ہوتا ہے۔ اسکے تحت ہم پر لازم ہے کہ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھیں کہ خدا ہمارا باپ ہوتے ہوئے ہم سے فرزندوں جیسے رویہ کی توقع کرتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ خدا باوجود میرا باپ ہونے کے "خُدا" بھی ہے لہٰذا ہمیں اُس کی خدائیت کا بھی خیال رکھنا ہے۔ عام حالتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم اس مقدس ہستی کا قرب اور نزدیکی حاصل کر لیتے ہیں تو اس کے تقدّس یعنی پاکیزگی اور جلال کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اور یہ مراعات کا سراسر غلط اور ناجائز استعمال ہے۔

ب۔ عزّت

عزت اور احترام سے مراد عام طور پر یہ لی جاتی ہے کہ کسی کو خطاب کرتے وقت خوبصورت اور برجستہ الفاظ کے استعمال کا خیال رکھا جائے۔ یہ طریقہ شائد ایک عام انسان کے لئے درست ہو جو کسی کے دل کی کیفیت سے بالکل واقف نہیں، لیکن ہمارا باپ جو ہمارے دل کے رجحانات اور بغاوت پر آمادہ خیالات کو جانتا ہے اس کے لئے کسی صورت میں بھی ہمارا ظاہری رویہ جس میں حقیقت کو دخل نہ ہو تسلی بخش نہیں۔ اِس لئے خدا باپ، بجائے میرے لفظی اور ظاہری احترام کے دِلی احترام کو پسند کرتا ہے، میرے دل میں اس کی عزّت ہو، اس کے ارشادات و فرمان میرے لئے مشعلِ راہ ہوں، اور میں دل سے ان کی بجا آوری کے لئے تیار رہوں۔

یہ احترام اس لئے نہیں کرنا چاہئے کہ نافرمانی کی صورت میں میرا باپ مجھے سزا دے گا یا ابدی عذاب میں مبتلا کریگا بلکہ اس کی تہہ میں محبّت کا اصول ہونا چاہیئے۔ چاہیئے کہ میں صرف اِس لئے اس کے احکام کی تعمیل اور احترام کروں کیونکہ مجھے اس مقدّس باپ کی مقدس ذات اور مقدس مزاج کا احترام ہے۔ میری بے راہ روی اور آوارگی سے اُس کے دل کو تکلیف ہوگی اور میں اپنے مقدس باپ کو رنجیدہ خاطر اور دُکھی نہیں کرسکتا۔

جو لوگ خدا کے احکام کی اس لئے پابندی کرتے ہیں کہ نافرمانی کی صورت میں سزا ملے گی، وہ اصل میں فرزندیت کے بلند درجہ اور ابوّیت (خدا کے باپ ہونے) کے مفہوم سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ایک مسیحی کی زندگی میں خدا کے احکام کا احترام اس لئے ہونا چاہیئے کہ اس کی بدپرہیزی سے اُسکے مقدس

اور آسمانی باپ کے ناموس اور عزّت پر دھبہ آتا ہے۔ کامل محبت خوف کو دور کرتی ہے لہٰذا خوف کرنے والا کبھی محبت میں کامل نہیں ہوا۔

ج۔ فرمانبرداری

وہ لوگ جو خدا کو مختارِ کُل اور قادرِ مطلق مانتے ہیں جنون کی حد تک پہنچ گئے ہیں اکثر سوال کرتے ہیں کہ جب خدا دیکھتا ہے کہ ہم گمراہ و برگشتہ ہیں تو اگر وہ اس قسم کی زندگی سے ناخوش ہے تو وہ ہمیں ایسی زندگی میں کیوں رہنے دیتا ہے؟ ان کا اِس قسم کے سوالات سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ خدا ہم سے جبر کیوں نہیں کرتا؟ جہاں تک اس قسم کے سوالات کی ظاہری اور منطقی صورت کا تعلق ہے یہ بڑے معقول اور مناسب سوالات ہیں۔ لیکن اس کے پس منظر میں غلامانہ ذہنیت نظر آتی ہے، جس میں خدا کی ابوّیت اور حقِ فرزندیت سے انکار کا عنصر موجود ہے۔ خدا کے فرزند خدا سے یہ توقع نہیں کرتے کہ خدا اُن سے جبراً اطاعت کروائے بلکہ جیسا اِس سے پہلے بیان ہو چکا ہے، اِس میں محبت کا اصول اور احترام کا رشتہ کام کرتا ہُوا نظر آتا ہے۔ خدا اِس بات میں کسی انسان سے زبردستی نہیں کرتا۔ بعض حالتوں میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے ہمارے حالات کو ہمارے برخلاف کر کے ہمیں ایک ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں ہم اس کی قوت اور اختیار کو تسلیم کر لیں۔ اِس میں بھی اکثر ہماری معاملہ فہمی اور دنیوی سُوجھ بُوجھ کی کمی ہوتی ہے، جس کے تحت ہم اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام ہو جاتے تو اپنی ناکامی اور شکست کا الزام خدا پر عائد کر دیتے ہیں۔ خدا نے ہمیں کامل آزادی دے رکھی ہے۔ اگر پسند کریں تو اُسکی اطاعت و فرمانبرداری اختیار

کر لیں، نہ چاہیں تو بغاوت پر آمادہ بھی رہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم لوقا ۱۵: ۱۱-۳۲ میں مُسرِف بیٹے کی تمثیل میں پاتے ہیں بیٹا اپنے باپ سے جدائی اختیار کر لیتا ہے، نہایت خراب و خستہ زندگی بسر کرنے لگتا ہے، لیکن باپ اِس پر بھی خاموش ہے۔ باپ نے اپنے بیٹے کو تلاش نہیں کیا، واپس آنے کیلئے کوئی پیغام نہیں بھیجا۔ باپ جانتا تھا کہ دنیوی معاملات میں اس کے بیٹے کی ناتجربہ کاری اُسکے بیٹے کے لئے نقصان کا باعث ثابت ہوگی۔ باپ کو علم تھا کہ وہ ضرور ایک دن افسوس کے ساتھ ہاتھ ملتا ہُوا واپس آئیگا۔ لیکن باپ نے اُس کو گھر واپس لانے کے لئے کوئی کوشش نہیں کی۔ کیوں کوشش نہیں کی؟ اس لئے کہ وہ بیٹا تھا۔ جس طرح مُسرِف بیٹے کو باپ سے بغاوت و سرکشی کا اختیار تھا اسی طرح اُسکو دوبارہ باپ کی شفقت کو قبول کرنے کا بھی حق حاصل تھا۔

مُسرِف بیٹے کی تمثیل سے پہلے دو چیزوں کے کھو جانے کا ذکر ہے۔ ایک بھیڑ، اور دوسری چیز ایک درہم ہے۔ لیکن ان دونوں چیزوں یعنی بھیڑ اور درہم کو اُن کے مالکوں نے تلاش کیا۔ جس چرواہے کی بھیڑ بھٹک جاتی ہے وہ باقی ننانوے بھیڑوں کو چھوڑ کر ایک گمشدہ بھیڑ کی تلاش میں رات کو نکل پڑتا ہے اور جب تک اُسے پا نہیں لیتا اُسے ڈھونڈتا رہتا ہے۔ جس عورت کا ایک درہم کھو جاتا ہے وہ بھی چراغ جلا کر اپنے پورے گھر میں جھاڑو دیتی اور اُس وقت تک درہم کو ڈھونڈتی رہتی ہے جب تک وہ مل نہیں جاتا۔

ان دونوں چیزوں کے لئے تردد کیا گیا کیونکہ ان میں سے ایک تو بے جان تھی اس لئے جھاڑو دے کر اسے تلاش کرنا پڑا، دوسری بھیڑ عقلِ سلیم سے خالی تھی اور اپنے مالک کے پاس خود واپس نہیں آ سکتی تھی۔ لیکن ایک تیسری چیز، جو ایک بیٹا کھو گیا یا خود بھٹک گیا تھا اُس کو تلاش نہیں کیا گیا، کیونکہ

وہ بیٹا تھا، بے جان چیز یا ایک حیوان نہیں تھا۔ اب بھی خدا ہم سے بیٹوں جیسا سلوک کرتا ہے اور کرنا چاہتا ہے۔

مسیحی مذہب میں اسی اصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے عبادت اور دوسری رسومات کے لئے کوئی انسان کا وضع کردہ اصول اور کوئی قید نہیں ہے بیٹوں کے لئے کون قانون نافذ کرتا ہے؟ اگر ایک غیر فانی قانون محبت خدا کے بیٹوں کی زندگی میں اطاعت و تابعداری کو پیدا نہیں کر سکتا تو باقی سب پابندیاں فضول اور بیکار ہیں۔

ایک پاسبان تھے جن کی کلیسیا کی ایک عمر رسیدہ خاتون سال بھر میں صرف ایک دو مرتبہ عبادت گاہ میں آتی تھیں۔ کلیسیا کے بعض افراد نے پاسبان سے کہا کہ آپ فلاں خاتون سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ باقاعدگی سے ہر عبادت میں شرکت کیا کریں؟ اگر وہ باقاعدگی اختیار نہ کریں تو اُسے کلیسیا کی رکنیت سے محروم کر دیں۔

پاسبان نے کہا کہ اگر اُسے ملامت کی جائے یا کلیسیا کی رکنیت سے محرومی کا نوٹس دیا جائے تو یہ چیزیں اُس کے دل میں مسیح سے محبت کو تو پیدا نہیں کر سکتیں، اُس کا عبادت گاہ میں نہ آنا یا کم آنا اِس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اُس کو خداوند سے کتنا پیار ہے۔ ہماری شر اور بغاوت جب عروج کو پہنچ جاتی ہے تو ہم خود ہی اپنی غلط کاریوں کی سزا پا لیتے ہیں۔ لیکن خدا باپ پھر بھی انتظار کرتا رہتا ہے کہ ہم اس کے پاس واپس آئیں اور اس کی اطاعت قبول کر لیں۔

د۔ نمونہ

خدا کے وہ فرزند جن کو زمین پر باپ ہونے کا شرف اور ذمہ داری خدا نے دے رکھی ہے، ان کے لئے یہ بات اور بھی زیادہ غور طلب ہے کہ وہ اگر خدا کی ابوّیت الٰہی کے مفہوم کو اپنے بچوں کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے کہ وہ آسمانی باپ کے اخلاق، پاکیزگی، برداشت، محبت اور دوسری جامع اوصاف کا ذکر کریں، پہلے خود زمینی باپ ہوتے ہوئے اپنا شخصی نمونہ اپنے بچوں کے سامنے رکھیں۔

ایک بچہ جس کو قدرت نے ہر طرح سے اس ماحول اور معاشرہ کا محتاج بنا کر بھیجا ہے اس بات کا بھی محتاج ہے کہ سب کچھ یہاں سے سیکھے یعنی ہم سے اور آپ سے سیکھے۔ ہم اُس کی ضمیر اور شخصیت کے معمار ہیں۔

موجودات میں قدرت نے ایک نظام کے تحت تمام جانداروں کی زندگی، ان کی پیدائش، پرورش، نسل کے تحفظ کے لئے اصول وضع کر رکھے ہیں۔ اور وہ جاندار خدا کے مقرر کردہ اصولوں اور قوانین کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بعض جاندار جب اپنے "بچے" پیدا کرتے ہیں تو ان کے بچے پیدائش کے تھوڑی دیر بعد ہی اپنے آپ کو سنبھالنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو باہر ویرانوں میں جہاں ان کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں ان کی نسل قائم نہیں رہ سکتی تھی۔

لیکن انسان! جسے خداوند تعالےٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے وہ اس قدر دوسروں کا محتاج اور دوسروں کے رحم و کرم کا حاجتمند ہے کہ اُس کی پیدائش کے بعد اگر اُسکی نگہداشت نہ ہو تو زندگی کے چند سانس بھی نہیں لے سکتا۔

ایک مقررہ مدت تک اسے کسی کے سہارے اور مدد کی ضرورت ہے۔ اِس دنیا کی ہر شے کے بارے میں اُسے دوسروں سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اس کی رہنمائی والدین یا سرپرستوں کا فرضِ اولین خیال کیا جاتا ہے۔

جس طرح ایک نووارد بچہ میرا اور آپکا محتاج ہے کہ اُس کی دنیا کے بارے میں علم حاصل کرنے میں مدد کی جائے، اسی طرح یہ میرا اور آپ کا فرض ہے کہ ہم اپنے بچونکو خدا کا پاکیزہ اور کامل تصور اُن کو دیں۔

جس طرح بت پرست والدین اپنے بچونکو بتاتے ہیں کہ خدا کی شکل فلاں بت کی طرح ہے، آتش پرست اپنے طریقہ سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح اصول کو سامنے رکھتے ہوئے ہم جو مسیحی ہیں اور خدا کو "باپ" مانتے ہیں اپنے چال چلن اور پاکیزہ نمونہ سے بچوں کے ذہن میں بٹھائیں کہ خدا باپ کیسا ہے۔

مسیحی والدین اور خصوصاً والد کی ذمہ داری کسقدر اہم اور کسی حد تک مشکل بھی ہے۔ اُسے اپنے اخلاق اور زندگی کے عملی نمونہ سے آسمانی باپ کا پاکیزہ، بے عیب اور زندہ نقش ایک معصوم ذہن پر چھوڑنا ہے جس کو دیکھ کر ایک بچہ آسمانی باپ کے پیار اور تقدس کا قائل ہو کر اُس کی پیروی کرنے کو تیار ہو سکے۔

آسمانی باپ کے نام کی تقدیس

خدا کے نام کے مقدس ہونے میں تو کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا، لیکن اِس بیان میں خداوند مسیح کا مقصد یہ تھا کہ خدا "باپ" کا نام اقوامِ عالم میں بھی پاک مانا جائے۔ اِس سے یہ مراد لینا ہماری غلطی ہوگی کہ خدا کو اپنے نام کے تقدّس کو ظاہر کرنے کے لیئے میری یا ہماری مجموعی مدد کی ضرورت ہے۔ ہرگز نہیں! بلکہ جب ہم اپنے آپ کو خدا کے فرزند کہتے ہیں اور خداوند کی دعا کے ان الفاظ کو دہراتے ہیں کہ "تیرا نام پاک مانا جائے" تو اس سے ہم اپنے فرائض کو انجام دیتے ہیں جو خدا کا فرزند بننے کے بعد ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ اُوپر بیان کر چکے ہیں کہ ایک بیٹے کا چال چلن باپ کی عزت و ناموس کو بہت حد تک متاثر کرتا ہے۔ حزقی ایل نبی نے اپنے صحیفہ کے چھتیسویں باب کی تیئیسویں آیت میں بیان کیا ہے "میں اپنے بزرگ نام کی جو قوموں کے درمیان ناپاک کیا گیا، جس کو تم نے اُن کے درمیان ناپاک کیا تھا تقدیس کرونگا، اور جب اُن کی آنکھوں کے سامنے تم سے میری تقدیس ہوگی تب وہ قومیں جانیں گی کہ میں خداوند ہوں"۔

مندرجہ بالا آیت کی روشنی میں ہم یہ معلوم کرتے ہیں کہ خدا کی قوم "اسرائیل" یعنی خدا کے فرزندوں کی غیر روحانی اور بُری زندگی کے باعث خدا کا قدوس نام اقوامِ عالم میں ناپاک گردانا گیا۔ خدا کے بیٹوں کے چال چلن

کا ان کے باپ "خدا" کے ناموس پر اثر پڑا۔ اب قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ خدا انہی
لوگوں سے اپنے نام کی تقدیس کروانا چاہتا ہے "جب اُن کی آنکھوں کے
سامنے تم سے میری تقدیس ہوگی" یعنی انہی لوگوں کے سامنے جن کے
درمیان خدا کا نام رسوا ہُوا تھا، خدا اپنے نام کی تعظیم کروانا چاہتا ہے

ا۔ ہماری شخصی زندگی میں

ممکن ہے کہ ہم خدا کی پاکیزگی اور تقدس پر بڑے موثر اور دل کو ہلا دینے
والے وعظ کر سکتے ہوں اور دلائل سے خدا کی پاکیزگی کا سکہ دوسروں کے
دلوں پر بٹھا سکتے ہوں، لیکن جو کچھ خداوند ہم سے شخصی طور پر طلب کرتا
ہے اس کو پورا کرنے سے قاصر ہوں۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ ہمارا طرزِ بیان نہایت دل کش اور نرالے
قسم کا ہو لیکن ہمارے دل کے کونے تاریک پڑے ہوں اور وہاں تک خدا
کی پاکیزگی کو رسائی حاصل نہ ہوئی ہو۔ ہماری زندگی کی کوئی لیاقت اور عمل
ہمیں مسیحی ثابت نہیں کر سکتا جب تک ہم خداوند کو اپنی شخصی زندگی میں مقدس
نہ مانیں اور اس کی پاکیزگی سے ہماری زندگی آراستہ نہ ہو جائے۔

مقدس پطرس اس حقیقت کو نہایت سادہ اور واضح الفاظ میں بیان
کرتا ہے "جس طرح تمہارا بلانے والا پاک ہے، اسی طرح تم بھی اپنے
سارے چال چلن میں پاک بنو" (۱پطرس ۱: ۱۵)۔

ب۔ ہماری خاندانی زندگی میں

بعض حالتوں میں ہم انفرادی طور پر کامیاب قسم کی مسیحی زندگی بسر کر رہے

ہوتے ہیں۔ ہم قول و فعل سے خداوند کی عزت کرتے ہیں اور ہماری زندگی سے
خداوند کے نام کی عزت و تکریم ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک ہماری خاندانی زندگی
کا نمونہ ہوتا ہے، اکثر بیوی بچوں کی عملی زندگی کے وسیلہ خداوند، اور اُس کا
قدوس نام روزانہ علانیہ ذلیل ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اگر خاندان میں بیوی
اور بچوں کا نمونہ مسیحی ہوتا ہے تو میاں کی زندگی سے خداوند عزت نہیں
پاتا، یا باقی خاندان کے سب افراد ایک ہی قسم کی پاکیزہ اور مسیحی زندگی کی
فضا میں سانس لے رہے ہیں تو خاندان میں سے صرف ایک ہی بچہ ہوتا
ہے جو ہمارے خاندان اور خصوصاً خدا کے لئے باعثِ ننگ ہوتا ہے۔

مصنف کو ایک دفعہ ایک نہایت ہی سرگرم مسیحی دوست سے ملاقات
کا اتفاق ہُوا جو اپنے سرکاری کام اور تمام محکمانہ مصروفیات سے فراغت
پا کر شام کے وقت اکثر اپنی بیوی کے ہمراہ لوگوں کے گھروں میں خدا کا کلام
سنانے جایا کرتا تھا اور یوں یہ دونوں میاں بیوی مل کر خداوند کی گواہی دیتے
تھے۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ اس خاندان کے بچوں کی زندگیاں
والدین کی مسیحی زندگی کا مذاق اڑاتی ہیں۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں جہاں کچھ لوگ تو نہایت سرگرم
مسیحی ہوتے ہیں لیکن دوسرے افراد کی زندگی خدا کے کلام کی مخالف ہوتی
ہے۔ بعض صورتوں میں انسان بے بس بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنی انتہائی
کوشش کے باوجود بھی دوسروں کو خداوند کے لئے جیتنے میں کامیاب نہیں
ہوتا۔ اس امر میں دعا کی بڑی ضرورت ہے کہ خداوند سب کو فرزندیت کا
حق عطا کرے تاکہ پورا خاندان مل کر خداوند کے نام کی تقدیس کا باعث
بن سکے۔

ج۔ ہماری مجموعی زندگی میں

زندگی میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں ہماری شخصی اور خاندانی زندگی مسیح کے تابع ہوتی ہے، اور ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ شخصی اور خاندانی زندگی سے خداوند کا نام پاک مانا جائے، لیکن اپنی سماجی اور کاروباری زندگی میں خداوند کے نقشِ قدم پر نہیں چلتے، اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ خیانت، دھوکہ، جھوٹ اور ناجائز نفع وغیرہ کاروباری زندگی کی جان ہیں، اور ان کے بغیر کاروبار میں کامیابی ناممکن ہے۔ لیکن خداوند کا رسول پطرس فرماتا ہے کہ "تم اپنے سارے چال چلن میں پاک بنو"۔ اس سے کیا مراد ہے؟ سارے چال چلن میں پاک بننے کا کیا مطلب ہے؟ کیا کاروباری زندگی ہمارے سارے چال چلن سے الگ ہے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اپنے سماجی حلقے اور دوست واحباب میں مذہبی گفتگو کرنا بھی حماقت ہے، زمانہ کا ساتھ دینا چاہئیے۔ گویا خداوند کو ہماری معاشرتی اور سماجی زندگی سے کوئی بھی سروکار نہیں۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ خداوند ایسے موقعوں پر بھی جلال پانا چاہتا ہے تاکہ "مسیح سب کچھ اور سب میں ہو" (کلسیوں ۳:۱۱)؟

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

آسمانی باپ کا تسلّط و اختیار

"تیری بادشاہی آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔"

خدا بلاشبہ تمام دنیا کا حاکم ومالک ہے۔ ساری دنیا میں اس کا تسلّط و اختیار موجود ہے۔ اُس سلطانوں کے سلطان اور حاکموں کے حاکم کے رعب و دبدبہ سے کون انکار کر سکتا ہے؟ لیکن جب خداوند یسوع نے اپنے حواریوں کو اپنی دعا کے مندرجہ بالا الفاظ کو دہرانے کی تلقین کی تو خداوند کا منشا یقیناً کچھ اور تھا۔

ا۔ تسلّطِ آسمانی

داؤد زبور ۱۴۸ کی ابتدائی آیات میں خداوند کے تسلّط اور حکمرانی کی کس قدر اچھی تصویر پیش کرتا ہے! وہ خدا کے فرشتوں، آسمانی لشکروں، آفتاب و ماہتاب، نورانی ستاروں اور فلک الافلاک کا ذکر کرتا ہے۔ جو خداوند کے تسلّط و اختیار کو مانتے اور اس کی تعظیم کرتے اور خدا کی مرضی کو بجا لاتے ہیں۔ خدا کے فرشتگان اُس کی حمد وثنا میں شب و روز مصروف ہیں۔ اور اس کی حمد وثنا میں ہمیشہ قدوس، قدوس پکارتے رہتے ہیں۔ آفتاب و ماہتاب اپنے مقررہ راستے پر گردش کر رہے ہیں۔ اُس نے آفتاب کے

لیے اُن میں خیمہ لگایا ہے جو دلہے کی مانند اپنے خلوت خانہ سے نکلتا ہے اور پہلوان کی طرح اپنی دوڑ میں دوڑنے کو خوش ہے۔ وہ آسمان کی انتہا سے نکلتا ہے اور اس کی گشت اس کے کناروں تک ہوتی ہے اور اس کی حرارت سے کوئی چیز بے بہرہ نہیں" (زبور ۱۹: ۴-۶)۔ خدا کی یہ تمام دستکاریاں خدا کے ارادہ اور حکم کی تعمیل کرتی ہیں۔ وہ قادرِ مطلق اور حاکمِ کُل ہے اور کوئی بھی طاقت اُسکے حکم کو ٹال نہیں سکتی۔

ب۔ تسلّطِ موجودہ

"تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو"۔ خداوند کی دُعا کے اِن الفاظ میں خداوند کے تسلّطِ آسمانی کو مقدّم، اور تسلّطِ زمینی کو مؤخر رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں عالموں اور ان کی تخلیق اور کائنات کی ترتیب بھی اسی طرح سے ہے۔ اور خداوند کا منشا اس ترتیب سے یہ ہے کہ جس طرح خداوند کے تسلّط کو آسمان کے رہنے والے تسلیم کرتے ہیں، اسی طرح زمین پر رہنے والے بھی کریں۔

خداوند کے تسلّط و اختیار کو زمین پر قائم کرنے اور اس کی مرضی کو اِس دنیا میں پورا کرنے کے لیئے سب سے پہلی چیز جو پیدا ہوتی ہے وُہ ہے۔

(۱) شخصی مخصوصیّت۔ اگر خداوند خدا زمین و آسمان کا خدا ہے، اور اگر اس کی شہنشاہیت میں کوئی شک وشبہ نہیں تو چاہیئے کہ سب سے پہلے میں خود اس کے تسلّط و اختیار کو تسلیم کر کے اپنی گردن اس کے سامنے جھکا دوں۔ کسی شخص کو کسی بادشاہ کی سپاہ میں شامل ہو کر اس وقت تک جنگ کرنے کی اجازت نہیں ہوتی جب تک وہ اپنے بادشاہ کے سامنے حلفِ

وفاداری نہیں اٹھاتا۔ ہمیں خدا کی بادشاہت کی ترقی کے لیئے دعا کرنے اور کوشاں ہونے کا کیا حق ہے جب تک کہ ہم اُس کے اختیار کو قبول نہیں کرتے۔ بعض حالات میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم دل میں تو خدا کے رعب اور دبدبہ کے قائل ہوتے ہیں لیکن ساؤل بادشاہ کی طرح جس نے داؤد جیسے خداوند کے ممسوح بادشاہ کو تسلیم نہیں کیا ہم بھی اپنے غرور اور تکبّر کے تحت اپنی شکست کا اعتراف کرنے کے لیئے آمادہ نہیں ہوتے۔ ہم اس کی کامیابی اور کامرانی کو تسلیم کرنے کے لیئے تیار نہیں ہوتے۔ اس صورت میں ہمارا مسیح کو بادشاہ کہنا محض زبانی اور لفظی ہوتا ہے، اور جس طرح ساؤل ایک مردود بادشاہ ہونے کے باوجود اپنے تخت پر بیٹھا رہا ہم بھی اس تخت پر خود قابض رہنا چاہتے ہیں۔ جو کہ دراصل ہمارا نہیں بلکہ اُس ممسوح بادشاہ کے لیئے تیار کیا گیا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم خداوند کی بادشاہت کے لیئے کچھ کریں یا کہیں، خداوند سب سے پہلی چیز جو ہماری زندگی میں دیکھنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم خود مسیح کے مطیع ہو جائیں، تاکہ وہ سب سے پہلے ہماری زندگی سے اپنی بادشاہت کو شروع کر سکے۔ خداوند کو ہماری وفاداری کے عہد و پیمان، ہماری کوشش، ہماری قربانیوں، ایثار اور ہدیوں کی ضرورت نہیں، بلکہ اُسے ہماری ضرورت ہے۔ اگر ہم خود اُس کے نہیں تو خداوند کو ہماری کسی بھی چیز سے خوشی نہیں ہو سکتی، اور نہ وہ ہماری محنت و مشقت پر کوئی برکت نازل کر سکتا ہے۔

(۲) شخصی نمونہ۔ کسی فردِ واحد یا اقوام کو بزورِ تلوار اپنی ماتحتی میں لینے کا طریقہ اب قریب قریب تمام دنیا میں بے اثر اور بے فائدہ ثابت ہو چکا

ہے۔ انسان نے اس طریقہ کو استعمال کرنے کے بعد اب یہ دریافت کر لیا ہے۔ اس طریقہ سے دوسروں کی املاک، اور اس کے جسم پر تو کسی حد تک اپنا تسلط قائم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مفتوح کے دل میں فاتح اور قابض کے لئے حقیقی عزت و تکریم پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسانوں کے دلوں پر حکومت کرنے کے لئے تشدد اور طاقت کا استعمال بے سود ہے۔

ایک جنگ کے ختم ہونے کے بعد دوسری جنگ اس لئے وجود میں آ جاتی ہے کہ جب ایک ملک یا قوم اپنے محدود وسائل کے باعث یا انتظامی خامیوں کی وجہ سے شکست اٹھاتی ہے یا ایک سلطنت دوسری پر اپنا قبضہ جما لیتی ہے تو شکست خوردہ قوم یا ملک کے افراد کے ذہن فاتح کے خلاف نفرت اور حقارت سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک ذہنی جنگ جاری رہتی ہے جو وقت آنے پر ایک جابر و ظالم کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، اپنے کندھوں پر سے غلامی کا جوا اتار پھینکتی ہے، اور قابض کو نہایت شرمساری کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

اسی قسم کی مثالوں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں جب انگلستان اور جرمنی کے مابین جنگ ہوئی تو جرمن قوم کو شکست ہوئی، لیکن اس شکست کا احساس جرمن قوم کے ذہنوں کو جھنجھوڑتا رہا اور جب یہ احساس شدید ہو گیا تو موقع پا کر جرمن قوم ایک بار پھر میدان جنگ میں اتر آئی۔ اس سے بحث نہیں ہے کہ انہیں دوبارہ فتح ہوئی یا شکست۔ لیکن یہ بات مسلمہ حقیقت ہے کہ قوت کا استعمال بے سود ہے۔ قدرت ان لوگوں سے انتقام لیتی ہے، جو اس مادی طاقت کے بل بوتے پر اس دنیا پر اور انسان کے دلوں اور جسموں کو فتح کر لینا چاہتے ہیں۔ تاریخ میں اس قسم

کے ہزاروں واقعات آپ کو ملیں گے۔ ملک پاک و ہند کی تاریخ بھی اس قسم کا ایک ثبوت پیش کرتی ہے، انگریزوں نے اس ملک پر سو سال سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی، مغل تاجداروں اور کئی ہندو راجاؤں کا اقتدار ختم ہو گیا، لیکن پاک و ہند کی حکومتوں کے وجود میں آنے سے پہلے فضا انگریزوں کے لئے ناسازگار قسم کی پیدا ہو چکی تھی۔ ایک خاموش اور سرد جنگ اس ملک کے لوگوں کے ذہنوں میں شروع ہو چکی تھی، اور اس کا ظہور کئی قسم کی سیاسی جماعتوں کی صورت میں ہوا جو پر امن طور پر ہندوستان کو آزاد کروانا چاہتی تھیں، اور جنہوں نے حق و انصاف کے تقاضوں کے تحت انگریز کو یہ ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے نقشہ پر دو خود مختار اور آزاد حکومتوں کا اضافہ ہو گیا۔

اب ایک اور مثال آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ جنرل عبدالکریم قاسم نے ۱۹۵۸ء میں عراق کے شاہی خاندان کے خون سے ہولی کھیلی۔ نہایت بے دردی اور وحشیانہ طور پر شاہ فیصل اور اس کے پورے خاندان کو قتل کر دیا، اور عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس سانحہ نے عراقی عوام کو ایک بار لرزا دیا اور کسی نے بھی احتجاج نہیں کیا۔ اس جبر اور تشدد نے کیا لوگوں کو اپنے دام میں کر لیا؟ نہیں! ہرگز نہیں، بلکہ ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ تاریخ نے اسی عمل کو ایک بار پھر دہرایا، جن لوگوں کے دلوں میں عبدالکریم قاسم کے اس جبر و تشدد کے عمل نے نفرت اور حقارت کا بیج بو دیا تھا انہوں نے بغاوت کر دی اور جنرل قاسم کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور اسکی لاش کو دنیا کی عبرت کے لئے ٹیلیویژن پر دکھایا گیا۔

یہ سب مثالیں اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچاتی ہیں کہ تشدد اور طاقت

کا استعمال نہ صرف لوگوں کے دلوں کو فتح نہیں کر سکتا بلکہ لوگوں میں انتقامی جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے مسیحی مذہب نے کبھی کسی کو جبراً مذہب میں شامل ہونے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور مذہب کے سلسلہ میں جبر کی ہمیشہ مذمت کی ہے۔ مسیحی کلیسیا کے ابتدائی دور میں چند ایسی گھنونی مثالیں ملتی ہیں جب مذہب میں تشدد کو جائز قرار دیا گیا۔ لیکن وہاں پر مذہب سے زیادہ دنیوی اقتدار کی بھوک کا سوال تھا۔

موجودہ دور میں سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے مہذب ممالک اپنے سفارت خانوں کے ذریعہ اپنے ملک کے رسم و رواج، تمدن و ثقافت، اخلاق و رہن سہن کے طریقوں کی تشہیر کرتے ہیں اور ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ کسی ملک کے اصولوں اور اخلاق و تمدن سے متاثر ہو کر ترک وطن کر کے دوسرے ملک میں جا کر مقیم ہو جاتے ہیں۔

دیکھیئے بادشاہت کی ترقی و توسیع کا کسقدر پرامن، مؤثر، اور کامیاب طریقہ ہے! وہ کام جو اسلحہ و بارود کا استعمال اور ایٹم بم کی دھمکیاں نہیں کر سکتی تھیں، کیسی آسانی کیساتھ ہو رہا ہے۔

ہم مسیحیوں نے کبھی تیر و تلوار کو مذہب کی اشاعت کا وسیلہ نہیں سمجھا۔ لیکن ہم نے زبان کے تیر ضرور چلائے ہیں تاکہ مناظروں کے ذریعہ لوگوں سے مسیحیت کا لوہا منوائیں اور لفظی تکرار سے لوگوں کو لاجواب کر کے مسیحیت کی حقیقت کو ظاہر کر دیں۔ لیکن دنیا اب ایک ایسی منزل پر آ گئی ہے جہاں پر اب ان باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ انجیلِ مقدس کی تعلیم بھی یہی ہے کہ ہم اپنے ذاتی نمونہ سے مذہب کی سچائی دوسروں پر ظاہر کریں۔ مقدس پولس رسول فرماتے ہیں کہ "ہم مسیح کے ایلچی ہیں"۔ ایلچی کا کام لڑائی جھگڑا

کرنا نہیں ہوتا بلکہ اُس کے پاس اپنے ملک کی طرف سے خیر سگالی کا پیغام ہوتا ہے۔ سفارت خانہ کا قیام اور ایلچی کی موجودگی دونوں ملکوں کے درمیان صلح، امن اور دوستی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ایلچی (سفیر) اپنے اخلاق اور طرزِ عمل سے اپنے ملک کی برتری کو ثابت کرتا ہے۔ آپ کسی ملک کے سفارت خانہ میں جا کر دیکھیں، آپ محسوس کریں گے کہ گویا تھوڑی دیر کے لئے آپ خود اس ملک میں پہنچ گئے ہیں۔

خدا نے مجھے اور آپ کو ایلچی بنا کر اس ملک یعنی دنیا میں رکھا ہے۔ کیا لوگ میری اور آپ کی عملی زندگی سے متاثر ہوتے ہیں؟ آپ یقین کیجئے کہ جس روز ہماری موجودہ مسیحیت نے میدانِ عمل میں کود کر آسمان کی بادشاہی کے مقدس شہریوں جیسا نمونہ پیش کیا، اس روز لوگ سب کچھ چھوڑ کر اور تمام قیدوں کو توڑ کر جوق در جوق خداوند کے پاس آئیں گے آسمان کی بادشاہی ترقی کرے گی اور لوگ خداوند کی اطاعت و تابعداری کو قبول کریں گے۔

لیکن پیشتر اس سے کہ لوگ خداوند کے قدموں پر آئیں۔ مجھے اور آپ کو اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لینی چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ کیونکہ سب سے بڑی رکاوٹ جو خداوند کی بادشاہت کی ترقی میں ہے، وہ میرا اور آپ کا وجود ہی ہو۔ ہم گفتار کے غازی تو مشہور ہیں لیکن خداوند چاہتا ہے کہ ہم کردار کے غازی بھی ہوں، اور خداوند اس انتظار میں ہے کہ ہم خداوند کے زندہ خط بن کر خدا کی خوبیوں کو ظاہر کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس کی بادشاہی ضرور آئے گی لیکن میرے عملی اور شخصی نمونہ کی ضرورت ہے۔

ج۔ تسلّطِ موعودہ

مسیحی زندگی میں اکثر ہم ایسی منازل میں سے گذرتے ہیں جب ہم دنیا کی بغاوت، خودسری اور ابلیسی قوتوں کو عروج پر دیکھتے ہیں۔ غیر مسیحانہ اور شرارتی عناصر خدا کی پاکیزگی و بزرگی کا مذاق اڑاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس صورت میں ہم اپنی بشری کمزوری کے تحت ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور جیسے ایک اکیلا اور نہتا سپاہی اپنے مخالفوں کی فوج کو اپنے تعاقب میں آتے دیکھ کر دبک جاتا ہے۔ لیکن ہم اکثر اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہمارا خداوند ساری دنیا کا خدا ہے۔ دنیا کی تمام بادشاہتیں اور اختیارات تمام انسانوں کو وہی دیتا ہے۔ خداوند نے پیلاطس حاکم سے بھی کہا تھا کہ "اگر یہ اختیار تجھ کو اوپر سے نہ دیا جاتا تو تجھے نہ ملتا۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ مسیح خداوند جو "اوپر سے آیا تھا" اس دنیا میں آنے سے پہلے دنیا کی تمام شان و شوکت اور قدرت کا مالک تھا۔ اب بھی وہ اپنے باپ کے دہنے ہاتھ بیٹھا ہے، اور دنیا کی تمام قوت و قدرت اب بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ جب وہ اپنی زمینی زندگی میں اپنے باپ کا تابعدار رہا تو وہ تمام قدرت اور اختیار کو اپنے باپ سے حاصل کر چکا تھا۔

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں خداوند کو عزت و بزرگی نہیں ملتی کیونکہ اس دنیا کے بااختیار لوگ خدا کی عطا کردہ قوت کا غلط استعمال کرتے ہیں، تو اس بات کو ہمیں کبھی بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ دن دور نہیں جب دنیا کی تمام سلطنتیں ہلا دی جائیں گی اور زمین کے سب بادشاہ اپنے اختیار و دبدبہ کو خداوند کے قدموں پر ڈال دیں گے اور خداوند دنیا کی تمام قوموں کا انصاف کرے گا۔ خدا کے برگزیدوں کا شمار پورا ہوگا، اور خداوند اپنے

لوگوں کی تمام مشقتوں کو ختم کر دے گا اور انہیں اپنے ابدی آرام میں شریک و شامل کریگا، اور انکی آنکھوں کے سب آنسو پونچھ دیگا۔

د۔ تسلّطِ مطلوبہ

ہر بادشاہی کے قیام و استحکام کے لیئے شخصی اور اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر کوشش کے دنیا کا کوئی کام انجام نہیں پا سکتا۔ لیکن اب تک ہماری کلیسیاؤں کا طریقہ یہ رہا ہے کہ اگر خداوند یسوع مسیح کو اپنی بادشاہی کو پھیلانا ہے تو خود کوشش کرے۔ یا غیر ملکی مشنری ہمارے ملک میں آکر اس کام کو انجام دیں۔ اب تک بشارت کے کام کو ہم نے اپنی ذمہ داری خیال نہیں کیا۔ ہم اب تک غیر ممالک کی طرف اپنی آنکھیں لگائے ہوئے ہیں کہ وہ ہمارے لیئے سب کچھ کریں، اور یہ خیال نہیں کرتے کہ ہمارا بھی کچھ فرض ہے۔ ہمارے لیئے بھی خداوند مسیح نے اپنی جان صلیب پر قربان کی تھی۔ ہم سے بھی خداوند امید کرتا ہے۔ انجیل کی تعلیم کو پھیلانے کا کام جس قدر ضروری اور اہم تھا اسی قدر ہم نے اسکے بارے میں غفلت برتی ہے۔ ہم یہ بھول گئے ہیں کہ بشارت ہی خدا کی کلیسیا کی زندگی کا ثبوت ہے۔ زندگی ایک "تحریک" ہے اور سکوت و جمود "موت" کا نام ہے۔ اور خداوند کی گواہی نہ دینا نیز اپنی نجی اور کلیسیائی کوششوں اور وسائل کو صرف اپنے ہی تک محدود رکھنا، کلیسیا میں زندگی کا ثبوت پیش نہیں کرتا۔

ؔ "بھڑک بھی اٹھو اے شرار کہ زندگی کم ہے!
رُخِ حیات نکھارو کہ زندگی کم ہے"

کلیسیا کے عوام اور اکثر راہنما حالات کا رونا رونے میں مصروف ہیں۔

دنیا کا تعصب، مخالفت، اور بے انصافی کا شکوہ زبان پر ہے لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ اب تک ہم نے خمیر کی طرح اِس دنیا کو اپنے وجود سے متاثر نہیں کیا۔ خدا کی بادشاہی کو ایک نایاب ہیرے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس کو ہم نے اپنے عمل سے ایک نہایت ہی ناقص چیز بنا کر پیش کیا ہے۔ لوگ کیوں اس بادشاہی میں شریک ہوں؟ لوگوں کو کیا پڑی ہے کہ اس کے حصول کے لئے کوئی قربانی دیں، جب کہ لوگ مجھے ہی جو کہ خدا کی بادشاہی کا پرچارک ہے بے اثر پاتے ہیں؟ لوگ اُس وقت خدا کی بادشاہی کو قبول کر لیں گے جب میں اور آپ اس کو مؤثر اور دلکش انداز میں پیش کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

خدا کی نظرِ انتخاب غلط نہیں ہے۔ دنیا کو ملزم گرداننا چھوڑ دیں کیونکہ دنیا سچائی کو پانا چاہتی ہے۔ لیکن ضرورت اِس بات کی ہے کہ جس بادشاہی کی رویا میرے اور آپ کے سامنے ہے اس کی قدر و منزلت ہماری عملی زندگی سے بھی ظاہر ہو، تاکہ انسان جس نے اپنی حماقت اور نادانی کے تحت خدا کی حضوری کو ترک کر دیا تھا، وہ خدا کے پاس اُسی حالت میں پہنچایا جا سکے۔ انسان کو وہی قرب حاصل ہو جو اُسکے پاس پہلے تھا۔ جب خداوند نے خدا کی بادشاہی کی تعلیم دی اور کہا کہ تم اِس دعا میں یہ کہا کرو کہ "تیری بادشاہی آئے" تو خداوند کا یہی منشا تھا کہ اس بلند مرتبہ سے گرا ہوا انسان آسمان تک سرفراز کیا جائے، اور یہ خدا کے بیٹے کو قبول کئے بغیر اور اُس کی بادشاہت میں داخل ہوئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور اسکے لئے عمل کرنے کی ضرورت ہے

آسمانی باپ کی ہم رسانی

"ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے"

جب ہم خدا کو اپنا باپ قبول کر کے فرزندیّت کے رشتہ میں شامل ہو جاتے ہیں، اور ہمیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ ہمارا باپ سب باتوں سے واقف ہے، تمام بھیدوں کو جانتا ہے اور ہم سب کی ضرورتوں سے آگاہ ہے تو اُس سے اپنی کسی بھی ضرورت کے لئے کچھ کہنا بے سود ہے۔ خداوند یسوع مسیح نے اپنے شاگردوں کو یہ دعا سکھانے سے پہلے اِس امر کو واضح کر دیا تھا کہ "تمہارا باپ جانتا ہے کہ تم کِن کِن چیزوں کے محتاج ہو"۔ لیکن اس کے باوجود خداوند فرماتا ہے کہ تم اس طرح دعا کیا کرو کہ "اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے" "ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے" اب ذرا غور کیجئے کہ خداوند اس سے ہمیں کیا سکھانا چاہتا ہے۔

۱۔ آسمانی باپ کی حیثیّت و اختیار

اگر آپکو کسی کا باپ یا ماں ہونے کا شرف حاصل ہو لیے تو پھر آپ اپنے تجربہ کی بنا پر اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ اپنے بچوں کے لئے کسقدر حساس ہیں۔ اگر آپ کو اس بات کا تجربہ نہیں ہے، تو کم از کم آپ کو کسی نہ کسی سے پدرانہ شفقت ضرور ملی ہوگی۔ آپ نے اپنے والدین سے سیکھا ہوگا کہ وہ

آپ کی ضروریات کا کتنا خیال رکھتے تھے۔ یہ احساس غریب و امیر، شاہ و گدا، سب کے لئے یکساں ہے۔ ایک دولتمند باپ اپنے بیٹے کی زبان سے اُس کی خواہش کو سننے کا منتظر ہوتا ہے اور اس کی خواہش کو پورا کرنے میں اُس کی خوشی ہوتی ہے۔ غریب والدین پر اُن کے بچوں کی خواہشات اور فرمائش کا اثر کچھ مختلف ہوتا ہے۔ غریب اپنے بچّوں کی فرمائش اور خواہش سننے سے گھبراتا ہے۔ اور جب کوئی بچہ ایسا سوال کر ڈالتا ہے یا کسی چیز کا مطالبہ کرتا ہے جس کو پورا کرنے کی والدین میں ہمت نہیں تو والدین کو اذیت ہوتی ہے، اور وہ اپنی غربت اور بے بسی کا احساس کرکے تڑپ اٹھتے ہیں۔

لیکن باوجود دو مختلف حالتوں کے، جہاں تک تعلق احساس کا ہے! وہ دونوں قسم کے والدین کا مساوی ہے۔ غریبی اور امیری اس احساس کو کم و بیش نہیں کر سکتی۔ جس ذات سے ہمارا رشتہ فرزندیت قائم ہوا ہے، وہ ایسا خداوند ہے جو تمام دنیا اور کل موجودات کا مالک و خالق اور ادنےٰ و اعلےٰ مخلوقات کا روزی رساں ہے۔ وہ بقول یوناہ نبی "بحر و بر کا خدا ہے"۔ لیکن کبھی کبھی ایمان کی کمزوری کے باعث یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کمزور ہے اور بہت چھوٹا سا خدا ہے۔ اور وہ نقل مکانی کرکے دنیا کے کسی نامعلوم خطّہ کو جا چکا ہے۔ لعزر کی ایک بہن نے کہا تھا "اے خداوند اگر تو یہاں ہوتا تو میرا بھائی نہ مرتا"۔ اس بیان میں زیادہ زور "یہاں" پر ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند، محدود خدا ہے، اور وہ صرف اسی مقام پر مدد کر سکتا ہے جہاں پہ خود موجود ہو۔ بعض اوقات ہمارا بھی یہی رویہ ہوتا ہے۔ ہم اس دنیا کے لوگوں اور حالات کا شکوہ کرتے رہتے

ہیں۔ اپنے آپ کو دوسروں پر منحصر خیال کرتے ہیں۔ اگر فلاں مدد کرتا تو بہتر ہو جاتے! اگر فلاں جگہ چلے جائیں تو سودمند ہوگا! اگر فلاں قدم نہ اٹھایا جاتا تو ایسا نہ ہوتا! اس قسم کے خیالات اور رویہ کی تہہ میں خدا کی قدرت اور ہمہ دانی سے انکار کا جذبہ موجود ہے۔

مصنّف کو ایک دفعہ ایک گاؤں سے خبر آئی کہ ایک مسیحی خاندان اپنے جابر اور بے رحم زمیندار کے ہاتھوں بہت تکلیف اٹھا رہا ہے۔ جب میں اس گاؤں کو گیا اور اُس خاندان سے ملاقات کی تو سب ہی لوگوں نے شکایات اور شکوے شروع کر دئے، جس میں دبے الفاظ میں میری پاسبانی اور خدمت پر نکتہ چینی بھی شامل تھی۔ میں نے اُنکو سمجھانے کی بہت کوشش کی اور یقین دلایا کہ خداوند قوی ہے اور دنیا کے تمام انسانوں کی جانیں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ ہمارا باپ ہے۔ اس ساری تکلیف اور معاملہ کو خداوند کے سامنے رکھنا چاہیئے۔ خداوند نے اپنے کلامِ پاک میں فرمایا ہے کہ "جو تجھ کو چھُوتا ہے وہ میری آنکھ کی پتلی کو چھُوتا ہے"۔ بہت مجبور کرنے پر یہ لوگ دعا کرنے کو رضامند ہو گئے۔ دعائی اور خاص کر اس تکلیف کو خداوند کے سامنے پیش کیا گیا، لیکن اُن کے چہروں کے تاثرات سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ابھی خوش نہیں ہیں۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ میں اُس شخص کو کالے پانی کی سزا دلوا دوں یا اس کے گاؤں کو آگ سے بھسم کرا دوں، جو میرے لیئے مشکل تھا۔

میں اپنے پاسبانی دورہ پر جب قریب ایک ماہ کے بعد پھر اُس طرف گیا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص جو ان غریب مسیحیوں کو ناحق ستایا کرتا تھا، اپنے قبیلہ میں سے کسی دیرینہ دشمنی کی بنا پر قتل کر دیا گیا۔ اور اس

کی لاش کو پورے پندرہ روز کے بعد جنگل میں سے بہ مشکل تمام تلاش کیا گیا۔

میں نے اپنے مسیحی بھائیوں سے کہا کیوں، خداوند قوی و قادر ہے یا نہیں؟ وہ ساری دنیا کے انسانوں کی جانوں کا مالک ہے یا نہیں؟ اب بھی انہیں خداوند کی قدرت و اختیار کے سامنے سرنگوں ہونے میں حجاب محسوس ہو رہا تھا لیکن اُن کی جھکی ہوئی نظریں اس حقیقت کے اعتراف کی آئینہ دار تھیں۔

ب۔ ہماری ضروریات کے لئے فکرمندی

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اگر ایک جسمانی باپ، جس کے پاس محدود وسائل ہیں اپنے بچوں کی ضروریات کو محسوس کر سکتا ہے۔ تو وہ باپ جس کے پاس گدا کو شاہ بنانے کی طاقت اور اختیار موجود ہے کیونکر اپنے بچوں کی ضروریات سے غافل رہ سکتا ہے؟ جہاں تک ہماری ضروریات کا تعلق ہے، خدا ہمارے وجود میں آنے سے قبل ہی جانتا تھا۔

جب ہمارے منہ میں دانت نہیں تھے تو شیرِ مادر جیسی ہلکی غذا کا انتظام کیا۔ کیونکہ اس وقت ہمارا جسم سخت غذا کو برداشت نہیں کر سکتا تھا جب بدنی اور ذہنی نشوونما کی ضرورت تھی اور ہمارے بدنی تقاضے بڑھ گئے تو اُس نے اُن ضروریات کو پورا کرنے کیلئے اُس سے زیادہ قوی غذا کا انتظام کیا۔ اس خوراک کو چبانے کے لیے مضبوط دانت اور ہاضمہ کے لئے زیادہ قوی معدہ عطا کیا۔ جب ہم اپنی پیدائش کے وقت سے لے کر اب تک خدا کے بہترین انتظام کے تحت پرورش پاتے رہے ہیں تو اب کیا ہو گیا

ہے۔ خداوند اب ہمیں کیونکر نہیں سنبھال سکتا۔

خداوند مسیح نے متی ۶: ۲۵-۳۲ میں خدا کی پروردگاری کی مثالیں دے کر واضح کیا ہے کہ جب خدا ادنیٰ قسم کی کائنات کی، جو وقتی اور ناپائیدار ہے، اس قدر فکر کرتا ہے، گھاس اور جنگلی سوسن، تمام پرندوں اور چڑیوں وغیرہ کی پرورش کا خیال رکھتا ہے تو ہمیں جو کہ اُس کے بیٹے ہیں کیونکر نہ سنبھالے گا؟

خداوند آگے چل کر یہ بھی بتاتا ہے کہ "تم پہلے آسمان کی بادشاہی اور خدا کی راستبازی کو تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تم کو مل جائیں گی" یعنی ہماری تخلیق کا اوّلین مقصد خدا کی قربت و نزدیکی پانا اور اس کی اطاعت و تابعداری کرنا ہے۔ اس سے پہلے میں عرض کر چکا ہوں کہ جب انسان خدا کی اطاعت و تابعداری اختیار کر لیتا ہے تو خدا کی سب نعمتیں انسان کی ہو جاتی ہیں۔ اور اگر وہ خدا کی اطاعت کو قبول نہ کرے تو اُس کی زندگی صرف ایک بھکاری کی سی زندگی ہے۔ جو تمام دن در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے اور گلیوں کی خاک چھانتا ہے۔ اگر اس بھکاری سے سوال کیا جائے کہ تم زندہ کیوں ہو، تو وہ کبھی نہیں بتا سکیگا۔ یہ اپنی زندگی کا جائزہ لینے کا مقام ہے کہ آیا ہم اُس کے بیٹے بیٹیاں ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو آپکو یقین کر لینا چاہیئے کہ آپ خدا کے وارث اور مسیح کے ہم میراث ہیں۔

اگر کسی وقت آپ کا خدا سے فرزندیت کا رشتہ پیدا ہوا تھا اور خدا نے آپ کو اپنا بیٹا یا بیٹی بنا لیا لیکن کسی نافرمانی اور بدپرہیزی کے باعث وہ رشتہ دھندلا پڑ گیا تو آپ خدا کے بیٹے یسوع مسیح کے وسیلہ سے خدا کے پاس آکر پھر سے اُس رشتہ کو استوار کر سکتے ہیں لیکن اگر آپ

کو یقین ہے کہ آپ اِس کے بیٹے بیٹیاں ہیں تو آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ کی فکر مندی آپ کا کچھ سنوارنے کی بجائے بگاڑے گی۔ ضروریاتِ زندگی کے لئے فکر مندی، ایمان سے انکار کے برابر ہے" کیونکہ ان سب چیزوں کی تلاش میں تو غیر قومیں رہتی ہیں"۔ یہاں پر غیر اقوام سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا خدا سے کوئی رشتہ وناتہ نہیں۔ جو زندہ امید کے لئے نئے سرے سے پیدا نہیں ہوئیں۔ اگر آپ خداوند کے بیٹے ہیں تو خدا کا سب کچھ آپ کا ہے۔

ج۔ ہمارا اعتدال ضروریات

متی کی انجیل کے ۶ باب کی ۱۱ آیت کا اُردو ترجمہ یوں ہُوا "ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے" لیکن یونانی زبان سے اُس کا صحیح ترجمہ یوں ہے "ہماری روز کی روٹی ہر روز ہمیں دیا کر" جس طرح ہماری جسمانی اور روحانی زندگی کا آپس میں گہرا تعلق ہے اُسی طرح ہماری بدنی اور روحانی ضروریات کا بھی آپس میں گہرا رشتہ ہے۔ ان دونوں قسم کی زندگیوں کے قیام، پرورش اور تازگی کے لئے خوراک کی ضرورت ہے۔ بدنی نشوونما کے لئے مجھے جسمانی اور مادی خوراک کی ضرورت ہے، اور روح کی تازگی کے لئے آسمانی روٹی یعنی "المسیح" کی ضرورت ہے۔

یہوواہ خدا نے جب اسرائیلی کلیسیا کو ویرانے میں روٹی یعنی "من" دیا تو خدا کے اس عمل کو مُقدس پولس رسول نے ایک روحانی عمل کہا۔ رسول ظاہر کرتا ہے کہ اس ظاہری عمل سے ایک روحانی مراد تھی۔ اس کا مطلب روح کی خوراک کے لئے روحانی روٹی کی بہم رسانی ہے (۱۔کرنتھیوں

۱۰: ۳، ۴)۔ علاوہ اس کے جب خداوند مسیح یوحنا ۶: ۳۱-۳۵ کے مطابق اپنے شاگردوں سے مخاطب ہے تو شاگرد اُس روٹی کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے آباؤ اجداد کو موسیٰ کی معرفت بیابان میں ملی تھی۔ خداوند مسیح اس جسمانی روٹی کے مفہوم کو روحانی معانی میں لیتا ہے اور اس روٹی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حقیقی روٹی وہ ہے جو آسمان سے اتر کر دنیا کو زندگی بخشتی ہے۔ اور وہ روٹی "میں ہوں"۔

اب ہم ان دونوں قسم کی یعنی بدنی اور روحانی خوراک کا جدا جدا بیان کریں گے کہ اس میں حدِ اعتدال کیا ہونا چاہیئے!

(۱) جسمانی روٹی۔ جسمانی روٹی ایک ناگزیر ضرورت ہے لیکن خداوند مجھ سے اور اپنے تمام ایمانداروں سے اس امر میں اعتدال پسند کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کی آوارگی اور مسافرت کے زمانہ میں خدا نے یہ انتظام کیا کہ چالیس برس تک نہ تو اُس قوم کے لوگوں کے جوتے ٹوٹے اور نہ ہی ان کے کپڑے پھٹے (استثنا ۸: ۳، ۴ با ۲۹: ۵، نحمیاہ ۹: ۲۱)۔ لیکن ان کی روزانہ خوراک کا انتظام اس سے مختلف تھا۔ انہیں روزانہ خداوند کے حکم کے مطابق اپنے لئے من جمع کرنا پڑتا تھا۔ اور جب بنی اسرائیل نے خداوند کے انتظام کی مخالفت کی یعنی اپنی ضرورت سے زیادہ جمع کیا تو وہ اگلی صبح تک سڑ گیا اور اُن کے کام نہ آسکا۔

اسی طریقِ کار کو خداوند ہماری روزمرّہ کی زندگی میں ہم سے طلب کرتا ہے۔ کہ ہم ہر روز اُس کی قوت و قدرت اور بہم رسانی کے الٰہی انتظام پر بھروسہ کریں۔ میں ذاتی طور پر اب تک اِس قابل نہیں ہو سکا کہ روپیہ پیسہ جمع کروں۔ لیکن میں اس کا مخالف بھی نہیں ہوں اور نہ ہی خداوند مسیح کا یہ

مقصد تھا اور نہ اس سے یہ مراد ہے کہ ہم ضروریاتِ زندگی کا سامان اپنے پاس نہ رکھیں۔ لیکن ہماری زندگی میں لالچ اور حرص جو اکثر دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا ہے، یقیناً خداوند کی بزرگی اور شان کے خلاف ہے۔ خداوند کو اس وقت ضرور تکلیف ہوتی ہے جب ہم دولت جمع کرنے یا اپنے حقیر اور ادنٰے سے مفاد کی خاطر کسی دوسرے انسان کا خون تک بہانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جب ہم اپنی دولت کے نشہ میں خدا، مذہب، اخلاقی قدروں، سماج اور انسانیت کی حدود کو پھاند کر اخلاق سوز حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں تو خداوند کو ضرور بڑا رنج ہوگا۔

ہم اپنی ضروریات کے لئے حد سے زیادہ فکر مند نہ ہوں۔ اور اگر خداوند ہماری ضروریات کا لحاظ کر کے اپنے فضل و کرم سے ہمیں خوشحالی بخشتا ہے تو اپنی طرزِ زندگی کو نہ بگاڑیں اور نہ ہی متکبر بنیں۔

اگر خداوند کو یہ پسند ہو کہ وہ ہماری زندگی میں سے اپنی نعمتوں کی فراوانی کو روک لے تو ہم مایوس نہ ہوں۔ نہ حصول کے لئے ذاتی کوشش اور ناجائز طریقے استعمال کریں اور نہ حصول کے بعد متکبرانہ ردِ عمل، اور نہ دنیا کی چیزوں کے چھن جانے کا غم کریں۔ اِن حدود سے اگر تجاوز ہو تو یہ ظاہر ہوگا کہ ہم اپنی زندگی میں صرف روز کی روٹی کے خواہش مند نہ تھے، بلکہ دنیا کے لالچ کا بھوت ہم پر سوار تھا۔ اگر ہم سب حالتوں میں خوش رہیں تو یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ ہم اس سے صرف روز کی روٹی چاہتے ہیں۔ اگر اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ اور ہے تو وہ خدا کی ایک امانت ہے جس کا تصرف مجھ سے امانت داری کا تقاضا کرتا ہے کہ میں اپنے آپ کو اچھا امین ثابت کروں۔ اور اگر وہ اصلی مالک چاہے تو اُسے مکمل اختیار ہے کہ وہ

اپنی امانت کو کسی بھی وقت مجھ سے طلب کر سکتا ہے۔

روحانی روٹی۔ جس طرح ہمیں اپنی بدنی ضروریات کے لئے خدا کے انتظام پر بھروسہ کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح سے روحانی خوراک کا بھی یہی اصول ہے۔ بعض اوقات ہم اپنی روحانی زندگی کی تعمیر کے لئے بہت زیادہ فکر مند اور محتاط ہوتے ہیں۔ اور اپنی روحانی زندگی کی استقامت کے لئے جسمانی ریاضت وغیرہ کا سہارا لیتے ہیں۔ میں اپنے ایک دوست سے بخوبی واقف ہوں جو اکثر دعا اور روزہ کے ذریعہ سے اپنی روحانی زندگی کو مضبوط بنایا کرتا ہے۔ کیونکہ میرے اور اس کے مابین کسی قسم کا تکلف وغیرہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ اپنی باتیں مجھ سے کبھی نہیں چھپاتا۔ ہم اپنی مشکلات کو بڑی آسانی کے ساتھ ایک دوسرے سے کہہ سکتے ہیں۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب کبھی روحانی زندگی کے ناپ تول کا موقع ملا، میرے اُس عزیز دوست کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس کی زندگی ترقی کی بجائے تنزلی کی طرف جا رہی ہے، یعنی جتنی بھی خوراک اُس نے اپنی روحانی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ذخیرہ کے طور پر جمع کی تھی، اس میں کیڑے پڑ گئے اور اس تمام ریاضت کا کوئی بھی فائدہ نہیں ہوا۔

خداوند کی مرضی یہ ہے کہ ہم روحانی عالم بننے کی بجائے اُس کے کمزور بچے بنیں اور روزانہ زندگی میں اس سے فضل مانگیں جس طرح ایک شیر خوار بچہ اپنی ماں سے وقت کی خوراک مانگتا ہے۔ نہ وہ پورے دن کی اور دو چار ماہ کی خوراک جمع کرتا ہے اور نہ ہی اس کی ماں اس کو دینے پر رضامند ہو سکتی ہے۔ مقدس پطرس رسول فرماتا ہے کہ "نوزاد بچوں کی طرح خالص روحانی دودھ کے مشتاق رہو تاکہ اس کے ذریعہ سے نجات

حاصل کرنے کے لئے بڑھتے جاؤ۔ اگر تم نے خداوند کے مہربان ہونے کا مزہ چکھا ہے" (۱-پطرس ۲: ۲، ۳)۔ میرا اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ جب میں نے کسی وقت خداوند کا کلام سنانے سے پہلے اپنے آپ میں انتہائی کمزوری اور کمی پائی اور خداوند سے خاص فضل مانگا تو خداوند نے میری اُمید سے زیادہ اپنے جلال کے لئے استعمال کیا۔ بیشک اُس کی قدرت کمزوری میں پوری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب میں نے بڑی تیاری کی، اور پیغام تیار کرنے میں بہت سا وقت صرف کیا تو عین موقع پر سب کچھ بے اثر ثابت ہُوا۔ ایک مرتبہ میں ایک دعوت پر ایک کنونشن میں پیغام دینے گیا۔ میں نے بہت ہی تیاری کی۔ پیغام میں حوالہ جات کی کثرت تھی لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ سب کچھ بے فائدہ تھا۔ خداوند نے مجھے استعمال نہیں کیا اور مجھے سب سے زیادہ رنج کنونشن کمیٹی کے اس پیسہ کا تھا جو میرے سفر خرچ پر صرف ہوا۔

خداوند یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنی تمام تیاری کو اُسکے سامنے رکھ دیں تاکہ وہ ان مٹی کے برتنوں سے اپنی بے انتہا قدرت کو ظاہر کر سکے۔ لیکن اکثر یہ بہت کم ہوتا ہے۔ ہم اس پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور اسکے وقتوں کا انتظار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ یہی ہم میں سے بہت سے مسیحیوں کی زندگی میں ناکامی کا باعث ہے۔ کاش ہم اپنی روز کی روٹی اُس سے ہر روز مانگتے رہیں۔

مُعافی کی شرائط و اُصول

"ہمارے قرض ہمیں معاف کر اس لئے کہ ہم بھی اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں"۔ (بمطابق ایڈیشن ۱۸۶۲ء)۔

جس طرح ہم دعائے ربّانی کے باقی حصوں کو سطحی اور عام درجہ دیتے ہیں، خداوند کی دعا کے اِس ضروری اور اہم حصہ سے بھی یہی سلوک ہوتا ہے۔ جب سے اس دنیا کا نظام قائم ہُوا انسان اپنے سہو و خطا کو محسوس کرتا آیا ہے۔ انسان کے دِل میں اپنے قصور کے بارے میں افسوس اور معافی پانے اور معاف کرنے کا اصول موجود ہے۔ لیکن خداوند نے اپنی اس دعا میں قصور اور معافی کا ایک نیا اور انوکھا فلسفہ پیش کیا ہے۔ عام حالتوں میں یقینی طور سے نہیں کہہ سکتے کہ قرضخواہ یعنی معاف کرنے والے اور "مقروض" یعنی قصوروار ان دونوں کے مابین جو قصور اور خطا کی دیوار تھی وہ گرائی جا چکی ہے یا نہیں! معاف کرنے والے کو شک ہوتا ہے کہ معلوم نہیں اس قصوروار کا اقرار ظاہری تھا یا حقیقی! کون جانے اُس نے دل سے معافی مانگی تھی یا نہیں۔ نامعلوم اس معافی کا اس کے دِل سے بھی کوئی واسطہ تھا یا نہیں! قصوروار کو بھی شبہ ہوتا ہے کہ اس کے قرضخواہ کا دل اس کی طرف سے صاف ہوا ہے یا نہیں۔ اور عام طور سے فریقین کے شکوک و شبہات

بجا بھی ہوتے ہیں اور اس تلافی اور معافی کی ایک ڈرامہ سے زیادہ حیثیت نہیں ہوتی۔ لیکن مسیحی زندگی کا اصول اور طریقہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اگر ایک شخص دل سے اپنے قصور اور گناہ کا اعتراف نہیں کرتا تو دوسرے کی طرف سے بھی معافی ملنے کی ایسی ہی امید کرنی چاہیئے کہ دل سے معافی نہیں دی گئی۔ اگر ایک شخص اپنے قصوروار کو دل سے معاف نہیں کرتا تو اُسے یہ بھی یقین کر لینا چاہیئے کہ اگر کسی نے اُس سے معافی طلب کی یا اس نے کسی کے مجبور کرنے پر معافی دے بھی دی ہے تو اس میں کوئی صداقت نہیں۔ گویا اس کا فیصلہ ہم اپنے لئے خود ہی کر سکتے ہیں کہ اگر ہم کسی کو معاف کرنے کے لئے آمادہ نہیں تو ہمیں بھی معافی نہیں مل سکتی۔ اس دعا میں جو نیا اصول خداوند ہمیں سکھانا چاہتا ہے وہ یہی ہے کہ اگر ہم دوسروں کو تہہ دل سے معاف کرنے کے لئے تیار نہیں تو ہمیں بھی اپنے بے شمار اور سنگین قسم کے اور ناقابل بیان گناہوں کی جن کے تصور سے ہماری روحیں لرز جاتی ہیں، معافی کے لئے بھی خداوند سے اُمید نہیں کرنی چاہیئے۔ خداوند کی دعا کے یہ الفاظ ہمارے لئے ایک ترازو کا مقام رکھتے ہیں جن پر ہم اپنے آپکو تول سکتے ہیں۔ جب ہم خداوند کی دعا کے ان الفاظ کو دہراتے ہیں تو اپنے لئے خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہماری کیا حالت ہے۔ خدا کی یہ دعا ہمارے لئے آگاہی کا حکم رکھتی ہے "جس طرح ہم اپنے قصورواروں کو معاف کرتے ہیں" اگر کرتے ہیں تو یقیناً خداوند مجھے اور آپ کو معاف کرے گا، اگر نہیں تو وہ بھی نہیں کرے گا۔ لیکن ہم ہمیشہ خود غرض ہوتے ہیں۔ اس کو خداوند نے ایک مثال کے ذریعہ سے واضح کیا ہے (متی ۱۸ : ۲۱-۳۵)۔ ایک قرضدار اپنے قرضخواہ سے اپنا قرض معاف کروا لیتا ہے لیکن خود اپنے مقروض

بھائی کو ایک چھوٹی سی رقم معاف کرنے کو تیار نہیں۔ اس مثال میں آگے چل کر ذکر ہے کہ اِس خود غرض اور سنگدل شخص کا کیا حشر ہوا۔ ہمارا بھی یہی حشر ہوگا۔ اگر ہم اپنے بھائی کو معاف نہ کریں تو خداوند کا فیصلہ ہے کہ "میرا آسمانی باپ بھی تمہارے ساتھ اِسی طرح کرے گا اگر تم میں سے ہر ایک اپنے بھائی کو دل سے معاف نہ کرے۔"

۱۔ نوعیّتِ معافی

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم معافی کے الٰہی بھید کو کسی حد تک سمجھ کر قائل ہو جاتے ہیں کہ اپنے قصورواروں کے بڑے سے بڑے گناہ اور سنگین ترین جرائم کو بھی معاف کر دینا چاہیئے۔ لیکن ہم اس بات کے انتظار میں رہتے ہیں کہ لوگ اپنے گناہ اور قصور کا ہمارے سامنے اعتراف کر کے معافی مانگیں اور پھر ہم معاف کریں۔ یہ درست ہے کہ ہر قصوروار کو اپنا قصور مان لینا چاہیئے۔ اقرارِ گناہ کی یقیناً ضرورت ہے۔ لیکن مسیحی معافی اور خداوند کی اس دُعا کے معنی اس سے بھی بہت ہی بلند ہیں۔ جب ہم اپنے قصورواروں سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ہمارے سامنے دو زانو ہو کر گریں اور اپنے گناہوں کا اقرار کریں تو اس سے خود ستائی اور خود پرستی کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے۔ ہم کوئی خدا تو نہیں کہ لوگ معافی مانگنے کے لئے ہمارے پاس آئیں۔ اور نہ ہی مسیحی معافی کوئی بھیک ہے جو صرف مانگنے پر ہی دی جاتی ہے۔ یہ تو مسیحی کی زندگی کا ایک فطری جذبہ ہے جس کا دوسرے کے ردِ عمل سے کوئی واسطہ نہیں۔ جس طرح کوئی پھول سے خوشبو مانگتا نہیں بلکہ وہ خود دیتا ہے، اور جس طرح آگ کی فطرت ہے کہ وہ تپش اور روشنی دے، کوئی مانگے

یا نہ مانگے وہ دیتی ہے ، اسی طرح معافی کے بارے میں مسیحی کی زندگی میں ایک فیاضانہ رویہ ہونا چاہیئے۔ اقرارِ گناہ کوئی کرے یا نہ کرے ، معافی کوئی مانگے یا نہ مانگے مسیحی کا کام ہے کہ وہ معاف کرنے کو ہر وقت تیار رہے۔

جب خداوند یسوؔع کو مصلوب کیا گیا اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں کیلیں ٹھونکی گئیں تو خدا کے بیٹے کا مقدّس لہو بہنے لگا ، لیکن اس کے ساتھ ہی خداوند یسوؔع مسیح کے منہ سے عجیب قسم کے کلمات نکلے "اے باپ ان کو معاف کر کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ ہم کیا کرتے ہیں"۔ عجیب سماں تھا! خدا کے مسیح سے کسی نے معافی مانگی نہیں تھی۔ اس کے ستانے والوں کے دلوں میں تو ابھی گناہ کا احساس بھی پیدا نہیں ہُوا تھا لیکن خداوند نے انہیں معاف کر دیا۔

اسی طرح خداوند کے ایک شاگرد مقدّس ستفنؔس کو جب اس کے مخالفوں نے سنگسار کیا تو اِدھر تو پتھروں کی بارش ہو رہی اور اُدھر خداوند کا یہ بندہ کہہ رہا ہے کہ "اے خداوند یہ گناہ ان کے ذمہ نہ لگا" (اعمال ۷: ۵۴-۲۰)۔ ستفنؔس سے بھی کسی نے معافی نہیں مانگی تھی ، اور اس گروہ کا سردار ساؤؔل جو ستفنؔس کے قتل کی سازش کا رہبر تھا اس نے بھی ابھی تک اپنے اس گناہ کو محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن تاریخ یہ بتاتی ہے کہ خداوند مسیح نے جب صلیب پر سے اپنے مخالفوں کو معاف کر دیا تو خداوند کے اس عمل نے بہت سی زندگیوں کو متاثر کیا۔ اور خداوند کے شاگرد ستفنؔس نے جب اپنے خداوند کی طرح اپنے سنگسار کرنے والوں کے لئے اسی قسم کی دعا کی تو خداوند نے اس کے اس عمل سے بھی اپنا بڑا بھاری کام لیا اور خداوند کے بندہ شہید ستفنؔس کے خون کی بوندوں سے ساؤؔل

ترسیسی کی زندگی متاثر ہوئی جسکا اعتراف وہ خود بعد میں کرتا ہے۔

"وہ مر جاتے ہیں پر لاکھوں جہاں آباد کرتے ہیں" ہمارا طریقہ اور رویہ کسقدر گھٹیا اور مسیحی زندگی کے کسقدر برخلاف ہے۔ ہم اپنے قصورواروں کا انتظار کرتے ہیں کہ وہ آکر ہم سے معافی مانگیں اور ہم ان کو معاف کردیں۔ اور اگر کوئی خود معافی کے لیئے آنا پسند نہ کرے تو ہم دوسروں کی معرفت کہلواتے ہیں کہ "فلاں سے کہو اگر وہ خود آجائے اور اپنا قصور مان لے تو اُسے معاف کیا جائے گا۔ اور جب کوئی آکر معافی کی درخواست کرتا ہے تو ہمیں اس کی طرزِ گفتگو پر اعتراض ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو نہیں تھے! یا اُس کے کھڑے ہونے کا انداز مغرورانہ تھا! اُس کے لہجہ میں ذرہ بھی عاجزی نہیں تھی اس لیئے اس کو پوری معافی نہیں مل سکتی۔ یہ کس قسم کی مسیحی زندگی اور معافی ہے ؟ ایک مسیحی کو دوسروں کے قصور مان لینے اور معافی کی درخواست کرنے سے بھی پہلے معاف کر دینا چاہیئے۔ اس سے ہمارے ضمیر کو سکون اور روح میں آزادی ملتی ہے۔ یہی طریقہ مسیحی زندگی کی بلندی ہے۔

لوگوں سے مجھے یہ توقع کرنی چاہیئے کہ وہ قصور کرتے جائیں اور مجھے اور آپ کو انہیں معاف کرنے کیلئے تیار رہنا چاہیئے۔

ب۔ تلافی ومافات

معافی کا ایک اور طریقہ عام طور پر دیہات میں رائج ہے ، جب لوگ مشروط قسم کی معافی دیتے ہیں ، مجرم پر جرمانہ کیا جاتا ہے۔ اسکو تنبیہ کی جاتی ہے کہ اگر آئندہ کوئی ایسی حرکت کی تو کوئی معافی نہیں ملے گی۔ آئندہ

احتیاط رکھنا وغیرہ وغیرہ۔

اگر مجھے یا آپ کو اپنے قصوروں اور گناہوں کے لیئے کوئی جرمانہ ادا کرنا پڑتا تو ہمارا کیا حشر ہوتا؟ ہمیں کیا امید تھی؟ دنیا کی کونسی قربانی یا فدیہ ہم اپنے گناہوں کے عوض ادا کرتے ہیں؟۔

جب خدا نے اپنے بے عیب بیٹے کی عظیم قربانی کے طفیل ہمارے سب گناہ بغیر کسی جرمانے کے معاف کیئے ہیں تو مجھے اور آپ کو کیا حق ہے کہ جب دوسروں کو معاف کرنے کا موقع آئے تو ان پر شرائط عائد کریں اور جرمانے طلب کریں؟ خدا نے کب کہا تھا کہ صرف اتنے گناہ کرنا اور اس سے تجاوز نہ کرنا؟ اس نے کب حدِ اعتدال مقرر کی تھی کہ اگر اس حد سے بڑھ جاؤ تو معافی کی امید کم ہے اور دروازہ بند ہو جائے گا؟ یہی مشکل پطرس کے سامنے تھی اور اسی لیئے اس نے خداوند یسوع سے یہ دریافت کیا کہ "اے خداوند! اگر میرا بھائی میرا گناہ کرتا رہے تو میں کتنی بار اُسے معاف کروں، کیا سات بار تک؟" جو جواب خداوند نے دیا ملاحظہ ہو۔ "سات نہیں! بلکہ سات کے ستر بار تک"۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک تیرا بھائی تیرا گناہ کرتا رہے تو اُسے معاف کرتا رہ۔

ہمارا ایمان ہے کہ زندگی کے آخری سانس تک ہمارے لیئے معافی کا دروازہ کھلا ہے۔ خداوند تمام گنہگاروں کو بڑی فیاضی کے ساتھ معاف کرنے کے لیئے تیار ہے تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ اپنے ہم جنس انسانوں کے لیئے اس معافی کو محدود کر دیں۔

میں نے تجربہ سے دیکھا ہے کہ یہ معافی کا عمل جس قدر مسیحی زندگی کا لازمی جزو ہے، اسی قدر یہ مشکل بھی ہے۔ ابلیس ہمیشہ یہی کوشش

کرتا ہے کہ وہ ہمارے ہم جنس انسانوں کے وہ گناہ جو کہ ہم معاف کرنے کے بعد بھول بھی چکے ہوں دوبارہ بلکہ کئی بار یاد دلائے۔ وہ کہتا ہے کہ فلاں قصور تو یقیناً ناقابل معافی تھا! یہ تو اسقدر سنگین تھا، یہ تو اتنا مکروہ تھا، تم نے کیوں معاف کر دیا؟ ہماری زندگی اکثر ابلیس کے اس حملہ سے متاثر ہوتی ہے۔ ہم پھر سے اپنے دل کو غلاظت اور گندگی سے بھر لیتے ہیں۔ ہماری روحانی خوشی چھن جاتی ہے۔ ہمارے دل میں ایک مستقل درد پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم ابلیس کے اس مشورہ کو مان کر بھولی بسری باتوں کو یاد کر کے اپنے آپ کو پریشان کرتے ہیں، اور ابلیس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ میری زندگی کو پھر سے اپنا تختۂ مشق بنا لے۔

ہمیں صرف خداوند کے رویہ کا جائزہ لینا چاہیئے۔ خداوند نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے؟ وہ ہمارے گناہوں کو سمندر کی تہہ میں ڈال دیتا ہے جہاں سے پھر وہ انہیں یاد نہیں کرتا۔ اس نے ہماری بدکرداری ہم سے اتنی دور کر دی ہے جس طرح پورب سے پچھم دور ہے۔ جب وہ ہمیں ہماری ناراستی سے دھو کر ہمیں برف سے زیادہ سفید کر دیتا ہے تو ہم کون ہیں جو دوسروں کے گناہوں کو شیشہ میں رکھ کر دیکھتے رہیں؟

خداوند سے فضل مانگنے کی ضرورت ہے کہ وہ ہمیں اپنا سا مزاج بخشے۔ ہم خداوند کے فضل اور مدد کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ خداوند سے دعا کریں کہ جس طرح اُس نے مجھے معاف کیا ہے اسی طرح دوسروں کو معاف کرنے کا فضل عطا ہو۔

آزمائش

"ہمیں آزمائش میں نہ لا بلکہ بُرائی سے بچا"

دنیا کے بے شمار لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم آدم و حوا کی لغزش کو قدرِ خیر و شر پر محمول کر کے انسان کی بے بسی و نامرادی کا قائل ہو کر گناہ آلودہ زندگی میں رینگ رہا ہے، لوگ کہتے ہیں کہ اگر خدا جانتا تھا کہ انسان اس شجرِ ممنوعہ کو چھوئے گا، اس کے پھل کو کھائیگا تو خدا کی حضوری سے خارج کیا جائیگا تو خدا نے اس پھل کو پیدا کیوں کیا؟ اگر خدا جانتا تھا کہ حوا آدم کے گرنے کا باعث ہو گی تو خدا نے حوا کو پیدا ہی کیوں کیا؟ مطلب یہ ہوا کہ وہ پھل اور حوا کو پیدا کرنے والا چونکہ خدا ہے اس لئے قصور دراصل انسان کا نہیں بلکہ خدا کا ہے۔

یہ تمام خیالات انسان کے گناہ کی پیداوار ہیں، اور انسان کی کوتاہ نظری اور روحانی اندھے پن کے باعث ہیں۔ باغِ عدن میں جب خدا نے دریافت کیا تھا "کیا تم نے اس پھل کو کھایا؟" انسان کا جواب اسی قسم کا تھا، جس کا مطلب تھا کہ نہیں میرے مالک خدا میں نے تو خود نہیں کھایا، بلکہ مجھ کو کھلایا گیا ہے۔ حوا نے کھلایا ہے، اُسی حوا نے جس کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے۔ نہ تو اُس کو میرے ساتھ کرتا! نہ وہ مجھ کو

پھل کھانے کو دیتی اور نہ میں قصوروار ٹھہرتا۔ گویا اس میں سب سے زیادہ قصور تیرا ہے۔ یہ بہانہ سازی اور الزام تراشی انسان کا بہت پرانا طریقہ ہے جس کو انسان اپنی روزمرّہ زندگی میں دہراتا رہتا ہے۔ وہ اپنی کسی بھی غلطی اور لغزش کو اپنے ذمہ لینے کو تیار نہیں۔ الزام تراشی انسان کی برگشتہ فطرت کا خاصہ ہے۔

۱۔ آزمائش کی ماہیت نفسی

الزام تراشی اور بہتان بندی کو ایک طرف رکھ کر اور انسان کے تکبر اور غرور کو نظرانداز کر کے جب خدا کے مقدس کلام کو دیکھیں تو حقائق اور آشکار ہوتے ہیں۔ مقدس یعقوب اپنے خط میں اسی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے "جب کوئی آزمایا جائے تو یہ نہ کہے کہ میری آزمائش خدا کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ نہ تو خدا بدی سے آزمایا جاتا ہے اور نہ وہ کسی کو آزماتا ہے۔ ہاں ہر شخص اپنی ہی خواہشوں میں کھنچ کر اور پھنس کر آزمایا جاتا ہے۔ پھر خواہش حاملہ ہو کر گناہ کو جنتی ہے اور گناہ جب بڑھ گیا تو موت پیدا کرتا ہے" (یعقوب ۱: ۱۴-۱۵)۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ ہر آزمائش کا موجد خدا کو کہنا اور دوسروں پر الزام لگانا کس قدر ناانصافی اور زیادتی ہے۔ خدا جس نے ہمیں اپنے ہاتھوں سے بنایا اور جو ہماری کمزوریوں سے بھی آگاہ ہے وہ کس طرح ہماری لغزش کے سامان پیدا کر سکتا ہے؟

جب خدا نے انسان کو اس دنیا میں بھیجا تو انسان کو اس پوری کائنات کی خلافت بخشی تاکہ انسان تمام دنیا پر حکمرانی کرے۔ آدم کو کوئی مجبوری نہیں

تھی کہ وہ حوّا کے اصرار پر اس پھل کو کھائے۔ وہ اس پھل کو رد بھی کر سکتا تھا، انکار کا موقع تھا۔ اگر انسان کو تقدیر کا قیدی اور حالات کا پابند مان لیا جائے کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا تو انسان کی حیثیت ایک "مشین" سے زیادہ نہیں، اگر انسان اپنے کسی بھی فعل، نیکی اور بدی کا ذمہ دار خود نہیں تو یہ الٰہی توقعات، یہ سزا و جزا، یہ جنت و جہنم، قیامت و آخرت کا عقیدہ جس پر دنیا کے اکثر لوگوں کا ایمان ہے محض ایک تماشہ ہے

ہم بیان کر چکے ہیں کہ مسرف بیٹا آزاد تھا۔ اُسے حق حاصل تھا کہ اگر وہ اپنے باپ کے گھر رہنا پسند نہیں کرتا تو وہ اپنی جائداد کا حصہ حاصل کر کے الگ ہو جائے۔ پھر اُسے یہ بھی اختیار تھا کہ وہ اگر اپنی زندگی سے خوش نہ ہو تو باپ کے پاس واپس آجائے۔ اس تمثیل میں خداوند یسوع نے نہ صرف ایک بیٹے کی کہانی پیش کی بلکہ یہ ایک ایسی تمثیل ہے جس میں سے ہم تمام بنی آدم کی شکل دیکھتے ہیں۔

انسان اپنے لئے خود فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے کیا پسند ہے! رہا سوال کہ پھر انسان نے بدی کو اپنے لئے کیوں پسند کیا؟ یہ ایک الٰہی عنایت ہے جس نے انسان کو انسان رہنے دیا۔ ورنہ عزازیل کی بغاوت و سرکشی تو بہت ہلکی سی بات تھی۔ انسان اگر بغاوت کرتا تو دنیا کا شیرازہ بکھر جاتا۔ مصلحت خداوندی نے انسان کی زندگی میں ایک لوچ رکھ دی تھی جس کے تحت آدم کی طبیعت مخالف جنس یعنی عورت کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ وہ حوّا کے سامنے اس پھل کو کھانے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ حوّا کی زندگی کے طلسم کا اثر آدم کی زندگی پر اس قدر گہرا تھا کہ اُسے یہ پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہو سکی کہ یہ کیسا پھل ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اس کے کھانے کی ضرورت کیوں

پیش آگئی ہے؟ اس سے پہلے تو ہم نے اس کو کبھی نہیں کھایا!

حوّا کے اس طلسم اور آدم کی اس لغزش نے اس دنیا کے پورے نظام کو متاثر کر دیا اور خدا و انسان کے تعلقات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے تاکہ انسان کو اس شرمناک شکست کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتا رہے۔ خدا کو اپنی خدائیت کو برقرار رکھنے کی خاطر اس کمزور انسان کو جس سے وہ بے پناہ محبت رکھتا ہے سنبھالنے کے لئے اس کی دستگیری کی سبیل کرنی پڑی۔

اگر یہ نہ ہوتا تو میں خیال کرتا ہوں اس دنیا میں کوئی حسن و خوبصورتی نہ ہوتی۔ نظامِ عالم پر ایک سکوت و جمود کا عالم طاری ہو جاتا۔ نہ جدائیاں ہوتیں، نہ جدائی میں کرب و بے قراری، نہ خدا کے بیٹے کے ظہور کی ضرورت، نہ خدا کے بے عیب بیٹے کی قربانی، نہ اُس کے خون میں ان عاصی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں کا پانی شامل ہوتا۔

ب۔ جسم کی خواہش

آزمائش کے فلسفہ پر ایک سرسری سی نظر ڈالنے کے بعد ہم یہ ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ خدا کے مقدس کلام کی روشنی میں یہ معلوم کریں کہ آزمائش کا ہماری زندگی سے کیا واسطہ ہے، اور یہ آزمائش ہماری زندگی میں کس ترتیب سے واقع ہوتی ہے، کیونکہ ابلیس آدمِ اوّل کو آزمانے کے بعد خاموش نہیں ہو گیا، بلکہ بنی آدم کو آزمانے کے لئے اور انہیں اپنے مرتبہ سے گرانے کے لئے اب بھی کوشاں ہے۔ وہ آدم کی زندگی کو داغدار کرنے کے لئے حوّا کے وسیلہ سے آیا تھا کیونکہ حوّا آدم کی سب سے بڑی کمزوری

تھی۔ اگر خدا کے فرشتگان اور کائنات کا کوئی اور مخلوق آدم کو اس پھل کے کھانے کی ترغیب دیتا تو یقیناً آدم اس پیشکش کو ٹھکرا دیتا۔ اسی لئے شیطان آدم کے پاس اُس راہ سے آیا جس سے آنے کا آدم کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

خدا کے ایماندار بندوں کی زندگی میں بھی شیطان اسی طرح سے اپنا کام کرنے کے لئے آتا ہے۔ وہ وقت کی نزاکت کو خوب سمجھتا ہے اور زندگی کے مختلف موقعوں پر ہمارے مختلف میلانات کا خوب جائزہ لیتا رہتا ہے۔ وہ خداوند یسوع کے پاس اس وقت آیا تھا جب وہ چالیس روز کا بھوکا اور پیاسا تھا چنانچہ اُسنے آتے ہی کہا کہ ان پتھروں سے کہہ کہ روٹی بن جائیں۔ اِسوقت ہم کو اس سے بحث نہیں ہے کہ خداوند نے خدا کا بیٹا ہوتے ہوئے اپنے اختیار کا استعمال کیوں نہیں کیا' بلکہ ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ابلیس وقت کی نزاکت کو خوب سمجھتا ہے۔ مثلاً ایک جوان ایماندار کے سامنے وہ ضرور جوانی کی آزمائش لے کر آئے گا۔

میں نے جب خداوند کو قبول کیا تو ابھی نوجوان ہی تھا، جسم میں جوانی کا خون تھا۔ چہرہ پر سرخی تھی۔ ابلیس نے پورے چودہ برس تک میری نوجوانی کو اپنی آماجگاہ بنائے رکھنے کی کوشش کی، اور مجھے دکھی کیا۔ وہ ہمیشہ میرے سامنے اسی قسم کی آزمائش لے کر آتا رہا، اور یہی اُس کا طریق کار ہے، جس کو کام میں لاکر وہ خدا کے برگزیدوں کی زندگیوں کو داغدار کرنے میں مصروف ہے۔

ج۔ آنکھوں کی خواہش

جب ہم وقتی آزمائشوں کے دور سے گذر جاتے ہیں تو ابلیس دوسری قسم کی آزمائشوں کا سلسلہ شروع کر دیتا ہے، جن کا تعلق آنکھوں کی خواہش سے ہوتا ہے۔ یہی طریقہ اس نے حوّا کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ وہاں لکھا ہے کہ "عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لئے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے"۔ حوّا نے اس پھل کے بارے میں سنا اور پھر اس کو دیکھا اور کھایا۔ اس کے کھانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ یہ ہم اگلے حصّہ میں بتائیں گے۔ لیکن یہاں پر صرف اتنا بیان کرنا ضروری ہے کہ اس پھل کو دیکھنے سے عورت کے دل میں ایک قسم کا لالچ پیدا ہوا اور وہ اس خواہش سے مغلوب ہوئی اور پھر اس نے خود اس کو کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا۔

اسی طریقہ کو ابلیس نے خدا کے بیٹے مسیح کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ جب روٹی بنانے کی آزمائش کر چکا تو پھر "ابلیس نے اُسے اونچے پر لے جا کر دنیا کی سب سلطنتیں پل بھر میں دکھائیں"۔ یہ سب سلطنتیں دکھانے کا مقصد یہ تھا کہ خدا کا بیٹا مسیح اس دنیا کی شان و شوکت کو دیکھ کر مغلوب ہو جائے۔ دنیا کے گناہ اور گندگی میں تڑپتے ہوئے انسانوں کی نجات کا کام نامکمل رہ جائے اور یہ ساری دنیا اس شریر کے قبضہ میں ایک غیر معینہ مدت تک پڑی رہے (لوقا ۴: ۱-۱۵)۔

ہم نے لوقا کی انجیل میں لکھی ہوئی خداوندی آزمائشوں کی ترتیب کو نقل کرنا مناسب سمجھا ہے کیونکہ یہ ترتیب زیادہ منطقی اور فطرت انسانی

کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ یوحنا رسول نے بھی انسانی زندگی میں ان آزمائشوں کی یہی ترتیب پیش کی ہے "کیونکہ جو کچھ دنیا میں ہے یعنی جسم کی خواہش، آنکھوں کی خواہش، اور زندگی کی شیخی وہ باپ کی طرف سے نہیں بلکہ دنیا کی طرف سے ہے" (۱-یوحنا ۲: ۱۵، ۱۶)۔

ابلیس خدا کے تمام برگزیدوں کو اسی طرح سے آزماتا ہے۔ جب ابلیس یہ دیکھتا ہے کہ اب ایک شخص جسمانی اور جنسی قسم کی لذتوں سے مغلوب نہیں ہو سکتا تو اس کی زندگی میں لالچ اور خود غرضی کو داخل کر دیتا ہے۔ ابلیس نے پورے چودہ برس تک میرے وقت "جوانی" کو اپنے کام میں لانے کی کوشش کی، لیکن جب اس نے دیکھا کہ جوانی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اتر چکا ہے، اس کی لہروں کی شدت میں کمی آ گئی ہے، اب وہ میرے کام نہیں آ سکتی تو اس نے خود غرضی، لالچ اور بہت تھوڑے عرصہ میں امیر بننے کی خواہش کو زندگی میں داخل کر دیا، اور یہ ابلیس کا مسلمہ طریقہ ہے جس کو وہ کام میں لاتا ہے۔

د۔ زندگی کی شیخی

جب کشتیوں کو ڈبو کر دریا اتر جائیں، ہم روحانی سمجھ میں بالغ ہو جائیں، ہمارا ضمیر گھٹیا قسم کے گناہوں کی اجازت نہ دے تو پھر ابلیس ہماری زندگی میں انتہائی مہذب اور منجھے ہوئے گناہ لے کر داخل ہوتا ہے۔

ابلیس نے حوا سے کہا تھا کہ "تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔" انہیں معلوم نہ تھا کہ جب پھل کھانے کے بعد ان کی آنکھیں کھل جائیں گی تو انہیں سب سے پہلے

اپنی برہنگی نظر آئے گی۔ زندگی میں بڑا بننے کی خواہش کو لے کر ابلیس خداوند یسوع مسیح کے پاس بھی آیا تھا۔ "اگر تو خدا کے منہ کی باتوں سے زندہ رہنا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے، کوئی بات نہیں، اگر تو دنیا سے نفرت کرتا ہے تو یہ بھی معقول بات ہے۔ اگر تو اس دنیا کی خوشیوں کو حاصل کرنے کے لئے مجھے سجدہ نہیں کرنا چاہتا تو خیر ہے۔ لیکن ایک بات نہایت ہی معقول اور فائدہ مند ہے، اور وہ یہ کہ ہیکل کے کنگرے پر سے چھلانگ لگا دے۔ کیونکہ فرشتے موجود ہیں جو تجھے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیں گے، تجھے یقیناً کوئی چوٹ نہیں آئے گی، لیکن پورے عالم میں لوگ تیرے مداح ہو جائیں گے، تیرا نام ہو جائیگا۔ اتنی شہرت شائد تجھے صلیب بھی نہ دے سکے، جتنی تجھے اس عمل سے حاصل ہوگی۔"

آدم اول اور آدم ثانی پر ابلیس ایک ہی طرح کی آزمائش لے کر آیا۔ آدم اول ان آزمائشوں سے مغلوب ہو گیا، اور آدم ثانی نے ان آزمائشوں کو بڑی بے نیازی کے ساتھ ٹھکرا دیا، تاکہ ان کی بھی مدد کر سکے جن کی بعد میں آزمائش ہونے والی تھی۔ وہ خود بھی آزمایا گیا لیکن بے گناہ نکلا۔

جب تک ہم اور یہ دنیا قائم رہے گی ابلیس زندگی کے کسی مقام پر بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ لیکن یہ بات بالکل درست ہے کہ خدا کسی کو نہیں آزماتا بلکہ بقول یعقوب رسول "ہر شخص اپنی ہی خواہشوں میں کھینچ کر اور پھنس کر آزمایا جاتا ہے۔"

(۱) جسم کی خواہش (۲) آنکھوں کی خواہش (۳) زندگی کی شیخی، یہ تمام آزمائشیں مختلف وقتوں میں ہماری زندگی میں آتی ہیں۔ سب

سے پہلے ہمارا جسم خدا کی اہانت کرتا ہے۔ پھر خود غرضی اور لالچ خدا کی پروردگاری کا مذاق اڑاتا ہے۔ اور جب ہم ان مدارج سے آگے نکل گئے تو مہذّب گناہ زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جب ہم اپنی گفتگو میں دوسروں کو کمتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں تو ہم نہایت انکساری کے ساتھ دوسروں کی کمزوریوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ دوسروں کی روحانی زندگی پر نکتہ چینی کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ سوا اپنی برتری ثابت کرنے کے ہمارا اور کوئی مطلب نہیں۔ اگر ہمیں ہماری زندگی کی شیخی نہ ابھارے تو ہم کسی کے لئے کبھی بھی زبان نہ کھولیں۔ ابلیس کا یہ سب سے زیادہ کامیاب فریب ہے کہ وہ مجھے ہر وقت دوسروں کی کمزوریاں گننے میں مصروف رکھتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم دیانتداری سے اپنے باطن کا جائزہ لیں تو ہم پر یہ ظاہر ہو جائیگا کہ جسقدر گھنونی ہماری اپنی شخصیت ہے، شائد دنیا میں ایسا غلیظ انسان اب تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ زندگی کی شیخی اور تکبّر ایک مہلک ترین گناہ ہے۔ ابلیس اگر خدا کی قربت سے دور ہوا تو اسی گناہ یعنی "زندگی کی شیخی" کے باعث۔ وہ اپنے آپ کو تمام فرشتوں سے افضل خیال کرتا تھا۔ اُسے اپنے اِس مرتبہ پر فخر تھا۔ "تکبّر عزازیل را خوار کرد"۔ اور یہ گناہ شائد عام انسانوں میں تو کم ہو کیونکہ وہ جسم کی خواہش اور آنکھوں کی خواہش کے چکر میں رہتے ہیں، لیکن خدا کے خادموں میں عام ہے۔ جتنا وقت غیبت اور نکتہ چینی میں موجودہ کلیسیا کے راہنما صرف کرتے ہیں، شائد دنیا کا کوئی بھی شخص نہیں کرتا۔ باقی گناہوں کے ارتکاب کے لئے تو بڑے دِل گردہ کی ضرورت ہے لیکن غیبت اور نکتہ چینی تو گناہ کی لذت اٹھانے

کا سب سے سستا طریقہ ہے۔ دوسروں کی بدگوئی کرتے رہو اور اُن زندگی کی خامیوں کو پیش کر کے اپنی روحانی زندگی کا سکہ بٹھاتے رہو۔

یہ سب ایسی آزمائشیں ہیں جو ہمارے فطری تقاضوں کا لباس پہن کر آتی ہیں، اور ان کا لانے والا ابلیس ہے۔ خدا نہیں کیونکہ خدا کسی کو بدی سے آزماتا نہیں، بلکہ مقدس پولس کا تو یہ تجربہ ہے کہ خدا ہماری طاقت سے زیادہ ہمیں آزمائش میں نہیں ڈالتا بلکہ وہ آزمائش کے ساتھ ساتھ اس سے نکلنے کی راہ بھی پیدا کر دیتا ہے (۱۔کرنتھیوں ۱۰: ۱۳)۔ لیکن انسان کی گناہ آلودہ فطرت اس کی روحانی عقل کو تاریک کر کے بچاؤ کے تمام راستوں کو اس کے لئے بند کر دیتی ہے۔ انسان ہمیشہ وہ کرنے پر تیار رہتا ہے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے، ورنہ خدا تو اپنے کمزور بچوّں کی مدد کرتا ہے، وہ انہیں گناہ کے موقعوں سے بچاتا رہتا ہے۔ لیکن وہ اپنے بچوں کے ساتھ جبر کرنے کے لئے بھی تیار نہیں، کیونکہ جبر ابوّیتِ الٰہی کے شایاں شان نہیں۔ جبر کا خدا کی طرف سے خیال کرنا غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہے۔

جب خداوند نے اپنے شاگردوں کو یہ دعا سکھائی کہ تم کہا کرو کہ "ہمیں آزمائش میں نہ پڑنے دے" تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری زندگی کے کثیف میلانات سے واقف ہے، اُسے معلوم ہے کہ یہ اپنی طاقت سے آزمائشوں پر غالب نہیں آ سکتے، اُن کی مدد کرنے کی ضرورت ہے۔ یقیناً خداوند اپنے لوگوں کو آزمائشوں میں سنبھالتا اور بچاتا ہے۔

یوسف پر آزمائش آئی تھی، لیکن اس نے بڑی دلیری کا مظاہرہ کیا اور ابلیس کے قاصد فوطی فر کی بیوی کو مایوس کر دیا۔ شائد آپ کو

یہ خیال گذرے کہ یہ یوسف کی غلطی تھی کیونکہ اُسے اِس انکار کی بہت
بڑی قیمت دینی پڑی۔ ابلیس نے اسکا دامن چاک کر ڈالا، اور یہ چاک
دامانی یوسف کی بے عیب زندگی پر اہلِ مصر کی نظر میں ایک بدنما دھبہ
تھا، لیکن حقائق اس کے خلاف تھے۔

سجاد انصاری "محشرِ خیال" میں پیش کرتے ہیں کہ یوسف کی چاک
دامانی نے اس کی جھولی کو فتح مندی کے پھولوں سے بھر دیا، اور دامنِ
یوسف کا نہیں بلکہ فوطی فر کی بیوی یا ابلیس کا چاک ہوا ہوگا، یوسف
بے عیب تھا۔

خدا یہ جانتا ہے کہ میرے فرزندوں کی لغزشوں میں میرے نام کی
توہین ہے اس لئے وہ زندگی کے سب موقعوں پر ہماری حفاظت کرنے
کے لئے موجود ہے۔ مقدس یوحنا رسول اپنے پہلے خط میں فرماتا ہے
کہ "وہ شریر انہیں چھونے نہیں پاتا" (۱-یوحنا ۵ : ۱۸)۔ پھر عبرانیوں کے خط
میں مرقوم ہے کہ "جس صورت میں اس نے خود ہی آزمائش کی حالت میں
دکھ اُٹھایا تو وہ اُن کی بھی مدد کر سکتا ہے جن کی آزمائش ہوتی ہے"
(عبرانیوں ۲ : ۱۸)۔

لیکن خداوند اُن ہی کی مدد اور حفاظت کرتا ہے جو خود آزمائش سے
نکلنا پسند کرتے ہوں۔ جو خود آزمائشوں کو دعوت دیں یا آزمائشوں کا
پیچھا کریں، ان کے بارے میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ خواہش حاملہ
ہو کر گناہ جنتی ہے، اور گناہ جب بڑھ گیا تو موت پیدا کرتا ہے۔ خدا
کے مقدس کلام کی الہامی تاریخ کے پس منظر میں سے ایک سوال آپ
کے ذہن میں ابھر رہا ہوگا یعنی کہ نئے عہد نامہ میں تو یہ کہا گیا ہے کہ ہمارا

وقت ہماری ضرورت ہمارے سامنے آزمائشوں کو لے آتی ہے، لیکن
پرانے عہد نامہ میں تو خدا نے ایک شخص یعنی ایوب کو آزمایا تھا۔ یہ بالکل
درست ہے کہ خدا کبھی کبھی آزمائشوں کو آنے دیتا ہے۔ لیکن کن لوگوں
کی زندگی میں؟ جو ایوب کی طرح "کامل، راستباز، خدا سے ڈرتا، اور بدی
سے دور رہتا" ہو اور جو زندگی کے ہر نفع یا نقصان میں یہ کہہ سکے "خدا
نے دیا، خدا نے لیا، خدا کا نام مبارک ہو"۔

خدا مجھے اور آپ کو مسیحی زندگی کا معراج عطا کرے، تاکہ ہم اس
کی قربت میں رہ کر، زندگی کے تمام مدوجزر سے گذر کر اور ایمان کو
محفوظ رکھ کر خداوند سے اس زندگی کے تاج کو پا سکیں، جو عادل
منصف دینے کو تیار ہے۔

جب تک ہم اس جسم میں زندہ ہیں ہماری زندگی کا ہر عمل خداوند
کی بادشاہی کی ترقی، اس کی صلیبی قدرت کا مظہر اور اُس کے جلال کا
باعث ہو، کیونکہ

"بادشاہی، قدرت اور جلال ابد تک اُسی کا ہے"

آمین

عزیز قاری!

میں نے اس کتاب کو دعائے ربّانی کی تفسیر کے طور پر نہیں لکھا
ہے، اور نہ ہی میرا یہ دعویٰ ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اِس سے
زیادہ اس پر کچھ لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ میں نے تو ان باتوں کو بیان
کرنے کی کوشش کی ہے جو خداوند نے میری زندگی میں اِس دعا کے بارے
میں ظاہر کی ہیں۔ اِسی لئے میں نے اس کتاب کو حقیقتِ دعائے ربّانی

کا عنوان دیا ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اِس کتاب کو پڑھنے کے بعد آپ خداوند کی دُعا سے وہ سلوک روا نہیں رکھیں گے جو اس سے پہلے ہوتا رہا ہے۔ خداوند اپنی اِس دُعا کے معنی آپ پر اور بھی زیادہ واضح کرے!

آپکا مخلص
غلام مسیح نعمان

تمام شد

طابع ——— ایچ بخت
مطبع ——— نقوش پریس لاہور
بار ——— اوّل
تعداد ——— ایک ہزار
قیمت ——— ۶۰ پیسے
کتابت ——— تاج مسیح

★

مارچ ۱۹۶۷ء